اس شمارے میں

حرفِ اوّل

علمِ دین — حافظ عاطف وحید — 2

بیان القرآن

سورۃ البقرۃ (آیات ۱۷۷تا۱۸۸) — ڈاکٹر اسرار احمد — 3

فہم القرآن

ترجمۂ قرآن مجید، مع صرفی ونحوی تشریح — لطف الرحمٰن خان — 24

حکمت نبوی ﷺ

رسول اللہ ﷺ سے حقیقی محبت کے تقاضے — پروفیسر محمد یونس جنجوعہ — 35

علوم القرآن

قرآن میں حذف اور اُس کی اقسام — حافظ محمد زبیر — 39

علوم و فنون

اسلام اور فنِ تعمیر — مرزا عمران حیدر — 51

وَمَن يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا

(البقرہ: ۲۶۹)

قرآن اکیڈمی لائبریری
12/6/07
...کے ماڈل ٹاؤن لاہور

ماہنامہ

حکمتِ قرآن

لاہور

[illegible]

[illegible]

[illegible]

نائب مدیر: حافظ خالد محمود خضر

ادارۂ تحریر:

حافظ عاطف وحید۔ حافظ محمد زبیر

پروفیسر حافظ نذیر احمد ہاشمی۔ پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

جلد ۲۶ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۸ھ ۔ جون ۲۰۰۷ء شمارہ ۶

یکے از مطبوعات

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

36 کے ماڈل ٹاؤن لاہور۔ فون 3-5869501

publications@tanzeem.org

ویب سائٹ: www.tanzeem.org

سالانہ زرِ تعاون: 100 روپے، فی شمارہ: 10 روپے

انڈیا: 700 روپے۔ ایشیا، یورپ، افریقہ: 1100 روپے۔ امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا: 1400 روپے

حرفِ اوّل

بسم اللہ الرحمن الرحیم

علمِ دین

سورۃ التوبۃ کی آیت ۱۲۲ میں غزوۂ تبوک کے بیان کے سیاق وسباق میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

''اور اہل ایمان ایسے نہیں کہ نکل پڑیں (جہاد وقتال کے لیے) سب کے سب۔ تو کیوں نہ نکلے اُن میں سے ہر گروہ میں سے کچھ لوگ تا کہ وہ دین میں سمجھ بوجھ پیدا کریں اور تا کہ وہ اپنی قوم کو خبردار کریں جبکہ وہ لوٹ کر ان کی طرف آئیں' تا کہ وہ بھی بچ سکیں''۔

مفسرین نے اس آیۂ مبارکہ کے حوالے سے علم دین کی اہمیت اور فرضیت پر بحث کی ہے اور اس آیت کے مفہوم کو حدیث مبارکہ ''علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے'' کے ساتھ جوڑ کر حصول علم کے دو درجے' فرضِ عین اور فرض کفایہ' بیان کیے ہیں۔

علم دین کا حصہ جو فرضِ عین قرار پایا وہ ہے جس کے بغیر مسلمان نہ فرائض ادا کر سکتا ہے اور نہ ہی ممنوعات سے بچ سکتا ہے۔ لہٰذا ہر مسلمان مرد وعورت پر فرض ہے کہ عقائد کا بنیادی علم حاصل کرے' طہارت ونجاست کے احکام سیکھے' نماز' روزہ اور دیگر عبادات کا علم حاصل کرے' جو چیزیں حرام یا مکروہ ہیں انہیں معلوم کرے۔ جس شخص کو بیع وشراء' تجارت وصنعت یا اجرت وغیرہ کے کام کرنے پڑیں اس پر فرضِ عین ہے کہ وہ ان امور کے مسائل واحکام جانے۔ غرض جو کام شریعت نے ہر مسلمان کے ذمے فرض وواجب کیے ہیں یا حرام ومکروہ قرار دیے ہیں ان کے احکام ومسائل کا علم حاصل کرنا بھی ہر مسلمان (مرد وعورت) پر فرض ہے۔ ان تمام کاموں میں اللہ کے کلام کا علم سب سے بلند اور مفید ہے۔ اسی لیے نبی اکرم ﷺ نے ان لوگوں کو سب سے بہترین قرار دیا جو قرآن کا علم خود حاصل کریں اور پھر اسے دوسروں تک پہنچائیں۔

علم دین کا کچھ حصہ فرضِ کفایہ کے درجے کا ہے۔ اس میں متذکرہ بالا علوم کی تمام جزئیات و فروعات' قرآن وحدیث کے تمام معارف' رسائل ومسائل اور ان سے مستنبط احکام وشرائع کی جملہ تفصیلات شامل ہیں۔ ظاہر ہے علم کا یہ درجہ نہ ہر مسلمان کی قدرت میں ہے اور نہ ہر ایک پر فرضِ عین ہے۔ البتہ لازم ہے کہ ہر علاقے یا بستی میں کچھ افراد ضرور ہوں جو اِن علوم کے ماہر ہوں' تا کہ ضرورت پیش آنے پر ان اہل علم سے رجوع کیا جاسکے۔

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کی علمِ دین کے فروغ کے ضمن میں مساعی بھی اسی فرض کی ادائیگی کا حصہ ہیں۔ ماہِ رواں سے شروع ہونے والے کورسز کی تفصیل بیک ٹائٹل کے اندرونی صفحہ پر ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان مساعی کو شرفِ قبول عطا فرمائے۔ OO

دورۂ ترجمۂ قرآن

ڈاکٹر اسرار احمد

سُورۃُ البقرۃ

آیات ۱۷۷ تا ۱۸۲

﴿لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ
مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ
عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ
وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ
بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ؕ
اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ۭ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴿۱۷۷﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى ؕ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ
وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى ؕ فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ ۢ بِالْمَعْرُوْفِ
وَاَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ؕ ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰى
بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۸﴾ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِي
الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۹﴾ كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ
اِنْ تَرَكَ خَيْرًا ۚ ۖ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى
الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۸۰﴾ فَمَنْۢ بَدَّلَهٗ بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ فَاِنَّمَآ اِثْمُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ ؕ
اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۸۱﴾ فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا فَاَصْلَحَ
بَيْنَهُمْ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۸۲﴾﴾

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے' اس سورۂ مبارکہ میں کئی ایسی عظیم آیات آئی ہیں جو حجم کے اعتبار سے بھی او معنی وحکمت کے اعتبار سے بھی بہت عظیم ہیں' جیسے دو رکوع پہلے ''آیت الآیات'' گزر چکی ہے۔ اسی طرح سے اب یہ ''آیت البر'' آ رہی ہے' جس میں نیکی کی حقیقت واضح کی گئی ہے۔ لوگوں کے ذہنوں میں نیکی کے مختلف تصورات ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں ایک طبقہ وہ ہے جس کا نیکی کا تصور یہ ہے کہ بس سچ بولنا چاہیے' کسی کو دھوکہ نہیں دینا چاہیے' کسی کا حق نہیں مارنا چاہیے' یہ نیکی ہے' باقی کوئی نماز روزہ کی پابندی کرے یا نہ کرے' اس سے کیا فرق پڑتا ہے! ایک طبقہ وہ ہے جس میں چور اُچکے' گرہ کٹ' ڈاکو اور بدمعاش شامل ہیں۔ ان میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو یتیموں اور بیواؤں کی مدد بھی کرتے ہیں اور یہ کام ان کے ہاں نیکی شمار ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ جسم فروش خواتین بھی اپنے ہاں نیکی کا ایک تصور رکھتی ہیں' وہ خیرات بھی کرتی ہیں اور مسجدیں بھی تعمیر کراتی ہیں۔ ہمارے ہاں مذہبی طبقات میں ایک طبقہ وہ ہے جو مذہب کے ظاہر کو لے کر بیٹھ جاتا ہے اور وہ اس کی روح سے ناآشنا ہوتا ہے۔ ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ ''مچھر چھانتے ہیں اور سموچے اونٹ نگل جاتے ہیں''۔ ان کے اختلافات اس نوعیت کے ہوتے ہیں کہ رفع یدین کے بغیر نماز ہوئی یا نہیں؟ تراویح آٹھ ہیں یا بیس ہیں؟ باقی یہ کہ سودی کاروبار تم بھی کرو اور ہم بھی' اس سے کسی کی حنفیت یا اہل حدیثیت پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ نیکی کے یہ سارے تصورات مسخ شدہ (perverted) ہیں۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے اندھوں نے ایک ہاتھی کو دیکھ کر اندازہ کرنا چاہا تھا کہ وہ کیسا ہے۔ کسی نے اُس کے پیر کو ٹٹول کر کہا کہ یہ تو ستون کی مانند ہے' جس کا ہاتھ اُس کے کان پر پڑ گیا اس نے کہا یہ چھاج کی طرح ہے۔ اسی طرح ہمارے ہاں نیکی کا تصور تقسیم ہو کر رہ گیا ہے۔ بقول اقبال:

اڑائے کچھ ورق لالے نے' کچھ نرگس نے کچھ گل نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری!

یہ آیت اس اعتبار سے قرآن مجید کی عظیم ترین آیت ہے کہ نیکی کی حقیقت کیا ہے' اس کی جڑ بنیاد کیا ہے' اس کی روح کیا ہے' اس کے مظاہر کیا ہیں؟ پھر ان مظاہر میں اہم ترین کون سے ہیں اور ثانوی حیثیت کن کی ہے؟ چنانچہ اس ایک آیت کی روشنی میں قرآن کے علم الاخلاق پر ایک جامع کتاب تصنیف کی جا سکتی ہے۔ گویا اخلاقیاتِ قرآنی (Quranic Ethics) کے لیے یہ آیت جڑ اور بنیاد ہے۔ لیکن یہ سمجھ لیجیے کہ یہ آیت یہاں کیونکر آئی ہے۔ اس کے پس منظر میں بھی وہی تحویلِ قبلہ ہے۔ تحویل قبلہ کے بارے میں چار رکوع (۱۵ تا ۱۸) تو مسلسل

ہیں۔ اس سے پہلے چودھویں رکوع میں آیت آئی ہے: ﴿وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ۗ﴾ (آیت ۱۱۵) اِدھر بھی اٹھارہویں رکوع کے بعد اتنی آیتیں چھوڑ کر یہ آیت آ رہی ہے۔ فرمایا:

آیت ۱۷۷ ﴿لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ﴾ ''نیکی یہی نہیں ہے کہ تم اپنے چہرے مشرق اور مغرب کی طرف پھیر دو''

اس عمل کے نیکی ہونے کی نفی نہیں کی گئی۔ یہ نہیں کہا گیا کہ یہ کوئی نیکی ہی نہیں ہے۔ یہ بھی نیکی ہے۔ نیکی کا جو ظاہر ہے وہ بھی نیکی ہے، لیکن اصل شے اس کا باطن ہے۔ اگر باطن صحیح ہے تو حقیقت میں نیکی نیکی ہے، ورنہ نہیں۔

﴿وَلٰكِنَّ الْبِرَّ﴾ ''بلکہ نیکی تو اُس کی ہے''

﴿مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ﴾ ''جو ایمان لائے اللہ پر، یومِ آخرت پر، فرشتوں پر، کتاب پر اور نبیوں پر۔''

سب سے پہلے نیکی کی جڑ بنیاد بیان کر دی گئی کہ یہ ایمان ہے، تاکہ تصحیح نیت ہو جائے۔ ایمانیات میں سب سے پہلے اللہ پر ایمان ہے۔ یعنی جو نیکی کر رہا ہے وہ صرف اللہ سے اجر کا طالب ہے۔ پھر قیامت کے دن پر ایمان کا ذکر ہوا کہ اس نیکی کا اجر دنیا میں نہیں بلکہ آخرت میں مطلوب ہے۔ ورنہ تو یہ سوداگری ہوگئی۔ اور آدمی اگر سوداگری اور دکانداری کرے تو دنیا کی چیزیں بیچے، دین تو نہ بیچے۔ دین کا کام کر رہا ہے تو اس کے لیے سوائے اُخروی نجات کے اور اللہ کی رضا کے کوئی اور شے مقصود نہ ہو۔ یومِ آخرت کے بعد فرشتوں، کتابوں اور انبیاء (علیہم السلام) پر ایمان کا ذکر کیا گیا۔ یہ تینوں مل کر ایک یونٹ بنتے ہیں۔ فرشتہ وحی کی صورت میں کتاب لے کر آیا، جو انبیاءِ کرامؑ پر نازل ہوئی۔ ایمان بالرسالت کا تعلق نیکی کے ساتھ یہ ہے کہ نیکی کا ایک مجسمہ، ایک ماڈل، ایک آئیڈیل ''اسوۂ رسولؐ'' کی صورت میں انسانوں کے سامنے رہے۔ ایسا نہ ہو کہ اونچ نیچ ہو جائے۔ نیکیوں کے معاملے میں بھی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی جذبات میں ایک طرف کو نکل گیا اور کوئی دوسری طرف کو نکل گیا۔ اس گمراہی سے بچنے کی ایک ہی شکل ہے کہ ایک مکمل اُسوہ سامنے رہے، جس میں تمام چیزیں معتدل ہوں اور وہ اُسوہ ہمارے لیے محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی شخصیت ہے۔ نیکی کے ظاہر کے لیے ہم آپؐ ہی کو معیار سمجھیں گے۔ جو شے جتنی آپؐ کی سیرت میں ہے، اُس سے زیادہ نہ ہو اور اُس سے کم نہ ہو۔

کوشش یہ ہو کہ انسان بالکل رسول اللہ ﷺ کے اُسوۂ کاملہ کی پیروی کرے۔

﴿وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ﴾ ''اور وہ خرچ کرے مال اس کی محبت کے باوجود''

یعنی مال کی محبت کے علی الرغم۔ ''عَلٰى حُبِّهٖ'' میں ضمیر متصل اللہ کے لیے نہیں ہے بلکہ مال کے لیے ہے۔ مال اگرچہ محبوب ہے' پھر بھی وہ خرچ کر رہا ہے۔

﴿ذَوِی الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِی الرِّقَابِ ۚ﴾ ''قرابت داروں' یتیموں' محتاجوں' مسافروں اور مانگنے والوں پر اور گردنوں کے چھڑانے میں۔''

گویا نیکی کے مظاہر میں اوّلین مظہر انسانی ہمدردی ہے۔ اگر یہ نہیں ہے تو نیکی کا وجود نہیں ہے۔ عبادات کے انبار لگے ہوں مگر دل میں شقاوت ہو' انسان کو حاجت میں دیکھ کر دل نہ پسیجے' کسی کو تکلیف میں دیکھ کر تجوری کی طرف ہاتھ نہ بڑھے' حالانکہ تجوری میں مال موجود ہو' تو یہ طرزِ عمل دین کی روح سے بالکل خالی ہے۔ سورۂ آل عمران (آیت ۹۲) میں الفاظ آئے ہیں:
﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۬ؕ﴾ ''تم نیکی کے مقام کو پہنچ ہی نہیں سکتے جب تک کہ خرچ نہ کرو اس میں سے جو تمہیں محبوب ہے''۔ یہ نہیں کہ جس شے سے طبیعت اکتا گئی ہو' جو کپڑے بوسیدہ ہو گئے ہوں وہ کسی کو دے کر حاتم طائی کی قبر پر لات مار دی جائے۔ جو شے خود کو پسند ہو' عزیز ہو' اگر اس میں سے نہیں دیتے تو تم نیکی کو پہنچ ہی نہیں سکتے۔

﴿وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ﴾ ''اور قائم کرے نماز اور ادا کرے زکوٰۃ۔''

حکمت دین ملاحظہ کیجیے کہ نماز اور زکوٰۃ کا ذکر ایمان اور انسانی ہمدردی کے بعد آیا ہے۔ اس لیے کہ روحِ دین ''ایمان'' ہے اور نیکی کے مظاہر میں سے مظہر اوّل انسانی ہمدردی ہے۔ یہ بھی نوٹ کیجیے کہ یہاں ''زکوٰۃ'' کا علیحدہ ذکر کیا گیا ہے' جبکہ اس سے قبل ایتائے مال کا ذکر ہو چکا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اِنَّ فِی الْمَالِ لَحَقًّا سِوَى الزَّكَاةِ)) (۱)

''یقیناً مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی حق ہے۔''

یعنی اگر کچھ لوگوں نے یہ سمجھا ہے کہ بس ہم نے اپنے مال میں سے زکوٰۃ نکال دی تو پورا حق ادا

---

(۱) سنن الترمذی' کتاب الزکاۃ عن رسول اللہ ﷺ' باب ما جاء ان فی المال حقا سوی الزکاۃ۔

ہو گیا' تو یہ ان کی خام خیالی ہے' مال میں زکوٰۃ کے سوا بھی حق ہے۔ اور آپ ﷺ نے یہی مذکورہ بالا آیت پڑھی۔

ایمان اور انسانی ہمدردی کے بعد نماز اور زکوٰۃ کا ذکر کرنے کی حکمت یہ ہے کہ ایمان کو تروتازہ رکھنے کے لیے نماز ہے۔ از روئے الفاظ قرآنی: ﴿اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ﴾ (طٰہٰ) ''نماز قائم کرو میری یاد کے لیے''۔ اور انسانی ہمدردی میں مال خرچ کرنے کے جذبے کو پروان چڑھانے اور برقرار رکھنے کے لیے زکوٰۃ ہے کہ اتنا تو کم سے کم دینا ہوگا' تاکہ بوتل کا منہ تو کھلے۔ اگر بوتل کا کارک نکل جائے گا تو اُمید ہے کہ اس میں سے کوئی شربت اور بھی نکل آئے گا۔ چنانچہ اڑھائی فیصد تو فرض زکوٰۃ ہے۔ جو یہ بھی نہیں دیتا وہ مزید کیا دے گا؟

﴿وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا﴾ ''اور جو پورا کرنے والے ہیں اپنے عہد کو جب کوئی عہد کر لیں''۔

انسان نے سب سے بڑا عہد اپنے پروردگار سے کیا تھا جو ''عہد الست'' کہلاتا ہے' پھر شریعت کا عہد ہے جو ہم نے اللہ کے ساتھ کر رکھا ہے۔ پھر آپس میں جو بھی معاہدے ہوں ان کو پورا کرنا بھی ضروری ہے۔ معاملاتِ انسانی سارے کے سارے معاہدات کی شکل میں ہیں۔ شادی بھی شوہر اور بیوی کے مابین ایک سماجی معاہدہ (social contract) ہے۔ شوہر کی بھی کچھ ذمہ داریاں اور فرائض ہیں اور بیوی کی بھی کچھ ذمہ داریاں اور فرائض ہیں۔ شوہر کے بیوی پر حقوق ہیں' بیوی کے شوہر پر حقوق ہیں۔ پھر آجر اور مستأجر کا جو باہمی تعلق ہے وہ بھی ایک معاہدہ ہے۔ تمام بڑے بڑے کاروبار معاہدوں پر ہی چلتے ہیں۔ پھر ہمارا جو سیاسی نظام ہے وہ بھی معاہدوں پر مبنی ہے۔ تو اگر لوگوں میں ایک چیز پیدا ہو جائے کہ جو عہد کر لیا ہے اسے پورا کرنا ہے تو تمام معاملات سدھر جائیں گے' ان کی stream lining ہو جائے گی۔

﴿وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ﴾ ''اور خاص طور پر صبر کرنے والے فقر و فاقہ میں' تکالیف میں اور جنگ کی حالت میں''۔

یہ نیکی بدھ مت کے بھکشوؤں کی نیکی سے مختلف ہے۔ یہ نیکی باطل کو چیلنج کرتی ہے۔ یہ نیکی خانقاہوں تک محدود نہیں ہوتی' صرف انفرادی سطح تک محدود نہیں رہتی' بلکہ اللہ کو جو نیکی مطلوب ہے وہ یہ ہے کہ اب باطل کا سر کچلنے کے لیے میدان میں آؤ۔ اور جب باطل کا سر کچلنے کے لیے میدان میں آؤ گے تو خود بھی تکلیفیں اٹھانی پڑیں گی۔ اس راہ میں صحابہ کرام ؓ کو بھی تکلیفیں

اٹھانی پڑی ہیں اور جانیں دینی پڑی ہیں۔ اللہ کا کلمہ سربلند کرنے کے لیے سینکڑوں صحابہ کرامؓ نے جامِ شہادت نوش کیا ہے۔ دنیا کے ہر نظامِ اخلاق میں ''خیرِاعلیٰ'' (summum bonum) کا ایک تصور ہوتا ہے کہ سب سے اونچی نیکی کیا ہے! قرآن کی رو سے سب سے اعلیٰ نیکی یہ ہے کہ حق کے غلبے کے لیے‘ صداقت‘ دیانت اور امانت کی بالادستی کے لیے اپنی گردن کٹا دی جائے۔ وہ آیت یاد کر لیجیے جو چند رکوع پہلے ہم پڑھ چکے ہیں: ﴿وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ﴾ ''اور جو اللہ کی راہ میں قتل کیے جائیں (جامِ شہادت نوش کر لیں) انہیں مردہ مت کہو‘ بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تمہیں (ان کی زندگی کا) شعور حاصل نہیں ہے''۔

﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ؕ﴾ ''یہ ہیں وہ لوگ جو سچے ہیں۔''

راست بازی اور نیکوکاری کا دعویٰ تو بہت سوں کو ہے‘ لیکن یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے دعوے میں سچے ہیں۔

﴿وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ﴾ ''اور یہی حقیقت میں متقی ہیں۔''

ہمارے ذہنوں میں نیکی اور تقویٰ کے کچھ اور نقشے بیٹھے ہوئے ہیں کہ شاید تقویٰ کسی مخصوص لباس اور خاص وضع قطع کا نام ہے۔ یہاں قرآن حکیم نے نیکی اور تقویٰ کی حامل انسانی شخصیت کا ایک ہیولا اور اس کے کردار کا پورا نقشہ کھینچ دیا ہے کہ اس کے باطن میں روحِ ایمان موجود ہے اور خارج میں اس ترتیب کے ساتھ دین کے یہ تقاضے اور نیکی کے یہ مظاہر موجود ہیں۔ اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْھُمْ‘ اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْھُمْ (آمین یا ربّ العالمین)

اس کے بعد وہی جو انسانی معاملات ہیں ان پر بحث چلے گی۔ سورۃ البقرۃ کے نصفِ ثانی کے مضامین کے بارے میں یہ بات عرض کی جا چکی ہے کہ یہ گویا چار لڑیوں پر مشتمل ہیں‘ جن میں سے دو لڑیاں عبادات اور احکام و شرائع کی ہیں۔

آیت ۱۷۸ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى ؕ﴾ ''اے اہلِ ایمان! تم پر لازم کر دیا گیا ہے مقتولوں کا بدلہ لینا۔''

قَتْلٰی ''قَتِیْلٌ'' کی جمع ہے جس کے معنی مقتول کے ہیں۔ ''کُتِبَ'' کے بعد ''عَلٰی'' فرضیت کے لیے آتا ہے‘ یعنی تم پر یہ فرض کر دیا گیا ہے‘ اس معاملے میں سہل انگاری صحیح نہیں ہے۔ جب کسی معاشرے میں انسان کا خون بہانا عام ہو جائے تو تمدن کی جڑ کٹ جائے گی‘

لہٰذا قصاص تم پر واجب ہے۔

﴿اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ﴾ ''آزاد آزاد کے بدلے''

اگر کسی آزاد آدمی نے قتل کیا ہے تو قصاص میں وہ آزاد ہی قتل ہوگا۔ یہ نہیں کہ وہ کہہ دے کہ میرا غلام لے جاؤ' یا میری جگہ میرے دو غلام لے جا کر قتل کر دو۔

﴿وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ﴾ ''اور غلام غلام کے بدلے''

اگر غلام قاتل ہے تو وہ غلام ہی قتل کیا جائے گا۔

﴿وَالْاُنْثٰی بِالْاُنْثٰی ط﴾ ''اور عورت عورت کے بدلے۔''

اگر قتل کرنے والی عورت ہے تو وہ عورت ہی قتل ہوگی۔ قصاص و دیت کے معاملے میں اسلام سے پہلے عرب میں مختلف معیارات قائم تھے۔ مثلاً اگر اوسی خزرجی کو قتل کر دے تو تین گنا خون بہا وصول کیا جائے گا اور خزرجی اوسی کو قتل کرے تو ایک تہائی خون بہا ادا کیا جائے گا۔ یہ ان کا قانون تھا۔ اسی طرح آزاد اور غلام میں بھی فرق روا رکھا جاتا تھا۔ لیکن شریعت اسلامی نے اس ضمن میں کامل مساوات قائم کی اور زمانۂ جاہلیت کی ہر طرح کی عدم مساوات کا خاتمہ کر دیا۔ اس بارے میں امام ابوحنیفہ ؒ کا قول یہی ہے کہ تمام مسلمان آپس میں ''کُفو'' (برابر) ہیں' لہٰذا قتل کے مقدمات میں کوئی فرق نہیں کیا جائے گا۔

﴿فَمَنْ عُفِیَ لَہٗ مِنْ اَخِیْہِ شَیْءٌ﴾ ''پھر جس کو معاف کر دی جائے کوئی شے اس کے بھائی کی جانب سے''

یعنی مقتول کے ورثاء اگر قاتل کو کچھ رعایت دے دیں کہ ہم اس کی جان بخشی کرنے کو تیار ہیں' چاہے وہ خون بہا لے لیں' چاہے ویسے ہی معاف کر دیں' تو جو بھی خون بہا طے ہوا ہو اُس کے بارے میں ارشاد ہوا:

﴿فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ اِلَیْہِ بِاِحْسَانٍ ط﴾ ''تو (اس کی) پیروی کی جائے معروف طریقے پر اور ادائیگی کی جائے خوبصورتی کے ساتھ۔''

﴿ذٰلِكَ تَخْفِیْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ط﴾ ''یہ تمہارے ربّ کی طرف سے ایک تخفیف اور رحمت ہے۔''

اس کا رحمت ہونا بہت واضح ہے۔ اگر یہ شکل نہ ہو تو پھر قتل در قتل کا سلسلہ جاری رہتا

ہے۔لیکن اگر قاتل کو لا کر مقتول کے ورثاء کے سامنے کھڑا کر دیا جائے کہ اب تمہارے ہاتھ میں اس کی جان ہے‘ تم چاہو تو اس کو قتل کر دیا جائے گا‘ اور اگر تم احسان کرنا چاہو‘ اس کی جان بخشی کرنا چاہو تو تمہیں اختیار حاصل ہے۔ چاہو تو ویسے ہی بخش دو‘ چاہو تو خون بہا لے لو۔ اس سے یہ ہوتا ہے کہ دشمنیوں کا دائرہ سمٹ جاتا ہے‘ بڑھتا نہیں ہے۔ اس میں اللہ کی طرف سے بڑی رحمت ہے۔ اسلامی معاشرے میں قاتل کی گرفتاری اور قصاص کی تنفیذ حکومت کی ذمہ داری ہوتی ہے‘ لیکن اس میں مدعی ریاست نہیں ہوتی۔ آج کل ہمارے نظام میں غلطی یہ ہے کہ ریاست ہی مدعی بن جاتی ہے‘ حالانکہ مدعی تو مقتول کے ورثاء ہیں۔ اسلامی نظام میں کسی صدر یا وزیر اعظم کو اختیار نہیں ہے کہ کسی قاتل کو معاف کر دے۔ قاتل کو معاف کرنے کا اختیار صرف مقتول کے ورثاء کو ہے۔ لیکن ہمارے ملکی دستور کی رو سے صدر مملکت کو سزائے موت معاف کرنے کا حق دیا گیا ہے۔

﴿فَمَنِ اعْتَدٰی بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴾ ’’تو اس کے بعد بھی جو حد سے تجاوز کرے گا تو اس کے لیے دردناک عذاب ہے۔‘‘

یعنی جو لوگ اس رعایت سے فائدہ اٹھانے کے بعد ظلم و زیادتی کا وطیرہ اپنائیں گے ان کے لیے آخرت میں دردناک عذاب ہے۔

آیت ۱۷۹ ﴿وَلَكُمْ فِی الْقِصَاصِ حَیٰوةٌ یّٰاُولِی الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴾

’’اور اے ہوشمندو! تمہارے لیے قصاص میں زندگی ہے‘ تا کہ تم بچ سکو۔‘‘

معاشرتی زندگی میں عفو و درگزر اگرچہ ایک اچھی قدر ہے اور اسلام اس کی تعلیم دیتا ہے:
﴿وَاِنْ تَعْفُوْا وَتَصْفَحُوْا وَتَغْفِرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴾ (التغابن) ’’اور اگر تم معاف کر دیا کرو اور چشم پوشی سے کام لو اور بخش دیا کرو تو بے شک اللہ بھی بخشنے والا‘ رحم کرنے والا ہے‘‘۔ لیکن قتل کے مقدمات میں سہل انگاری اور چشم پوشی کو قصاص کی راہ میں حائل نہیں ہونے دینا چاہیے‘ بلکہ شدت کے ساتھ پیروی ہونی چاہیے‘ تا کہ اس سے آگے قتل کا سلسلہ بند ہو۔ آیت کے آخر میں فرمایا: ﴿لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ ’’تا کہ تم بچ سکو‘‘۔ یعنی اللہ کی حدود کی خلاف ورزی اور ایک دوسرے پر ظلم و تعدی سے بچو۔

آیت ۱۸۰ ﴿كُتِبَ عَلَیْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَیْرَا ۖ الْوَصِیَّةُ

﴿لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ﴾ ''جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آ پہنچے اور وہ کچھ مال چھوڑ رہا ہو تو تم پر فرض کر دیا گیا ہے والدین اور رشتہ داروں کے حق میں انصاف کے ساتھ وصیت کرنا۔''

ابھی قانونِ وراثت نازل نہیں ہوا تھا' اس ضمن میں یہ ابتدائی قدم اٹھایا گیا۔ دورِ جاہلیت میں وراثت کی تقسیم اس طرح ہوتی تھی' جیسے آج بھی ہندوؤں میں ہوتی ہے' کہ مرنے والے کی ساری جائیداد کا مالک بڑا بیٹا بن جاتا تھا۔ اس کی بیوی' بیٹیاں' حتیٰ کہ دوسرے بیٹے بھی وراثت سے محروم رہتے۔ چنانچہ یہاں وراثت کے بارے میں پہلا حکم دیا گیا کہ مرنے والا والدین اور اقرباء کے بارے میں وصیت کر جائے تاکہ ان کے حقوق کا تحفظ ہو سکے۔ پھر جب سورۃ النساء میں پورا قانونِ وراثت آ گیا تو اب یہ آیت منسوخ شمار ہوتی ہے۔ البتہ اس کے ایک جزو کو رسول اللہ ﷺ نے باقی رکھا ہے کہ مرنے والا اپنے ایک تہائی مال کے بارے میں وصیت کر سکتا ہے' اس سے زیادہ نہیں' اور یہ کہ جس شخص کا وراثت میں حق مقرر ہو چکا ہے' اُس کے لیے وصیت نہیں ہوگی۔ وصیت غیر وارث کے لیے ہوگی۔ مرنے والا کسی یتیم کو' بیوہ کو' کسی یتیم خانہ کو یا کسی دینی ادارے کو اپنی وراثت میں سے کچھ دینا چاہے تو اسے حق حاصل ہے کہ ایک تہائی کی وصیت کر دے۔ باقی دو تہائی میں لازمی طور پر قانونی وراثت کی تنفیذ ہوگی۔

﴿حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ۞﴾ ''اللہ تعالیٰ کا تقویٰ رکھنے والوں پر یہ حق ہے۔''

ان پر واجب اور ضروری ہے کہ وہ وصیت کر جائیں کہ ہمارے والدین کو یہ مل جائے' فلاں رشتہ دار کو یہ مل جائے' باقی جو بھی ورثاء ہیں ان کے حصے میں یہ آ جائے۔

آیت ۱۸۱ ﴿فَمَنْۢ بَدَّلَهٗ بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ﴾ ''تو جس نے بدل دیا اس وصیت کو اس کے بعد کہ اس کو سنا تھا''

﴿فَاِنَّمَآ اِثْمُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ ۭ﴾ ''تو اس کا گناہ ان ہی پر آئے گا جو اسے تبدیل کرتے ہیں۔''

وصیت کرنے والا ان کے اس گناہ سے بری ہے' اُس نے تو صحیح وصیت کی تھی۔ اگر گواہوں نے بعد میں وصیت میں تحریف اور تبدیلی کی تو اُس کا وبال اور اس کا بوجھ ان ہی پر

آئے گا۔

﴿اِنَّ اللّٰہَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ﴾ ''یقیناً اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا (اور) جاننے والا ہے۔''

آیت ۱۸۲ ﴿ فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا﴾ ''پھر جس کو اندیشہ ہو کسی وصیت کرنے والے کی طرف سے جانب داری یا حق تلفی کا''

اگر کسی کو یہ اندیشہ ہو اور دیانت داری کے ساتھ اس کی یہ رائے ہو کہ وصیت کرنے والے نے ٹھیک وصیت نہیں کی' بلکہ بے جا جانبداری کا مظاہرہ کیا ہے یا کسی کی حق تلفی کر کے گناہ کمایا ہے۔

﴿فَاَصْلَحَ بَیْنَھُمْ﴾ ''اور وہ ان کے مابین صلح کرا دے''

اس طرح کے اندیشے کے بعد کسی نے ورثاء کو جمع کیا اور ان سے کہا کہ دیکھو' ان کی وصیت تو یہ تھی' لیکن اس میں یہ زیادتی والی بات ہے' اگر تم لوگ متفق ہو جاؤ تو اس میں اتنی تبدیلی کر دی جائے؟

﴿فَلَآ اِثْمَ عَلَیْہِ﴾ ''تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے۔''

یعنی ایسی بات نہیں ہے کہ اس وصیت کو ایسا تقدس حاصل ہو گیا کہ اب اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی' بلکہ باہمی مشورے سے اور اصلاح کے جذبے سے وصیت میں تغیر و تبدل ہو سکتا ہے۔

﴿اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴾ ''یقیناً اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم فرمانے والا ہے۔''

آیات ۱۸۳ تا ۱۸۸

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ ۝ اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ فَمَنْ کَانَ مِنْکُمْ مَّرِیْضًا اَوْ عَلٰی سَفَرٍ فَعِدَّۃٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَ وَعَلَی الَّذِیْنَ یُطِیْقُوْنَہٗ فِدْیَۃٌ طَعَامُ مِسْکِیْنٍ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَیْرًا فَھُوَ خَیْرٌ لَّہٗ وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ شَھْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْہِ الْقُرْاٰنُ ھُدًی لِّلنَّاسِ

وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۖ وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ۗ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ۖ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۸۵﴾ وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ۖ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ ﴿۱۸۶﴾ اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ ۖ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ۗ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ ۚ فَالْئٰنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ ۪ وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۪ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ ۚ وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ فِي الْمَسٰجِدِ ۗ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا ۗ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۷﴾ وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۸﴾﴾

سورۃ البقرۃ کے نصفِ آخر کے مضامین کے بارے میں عرض کیا جا چکا ہے کہ یہ چار لڑیوں کی مانند ہیں جو آپس میں گتھی ہوئی ہیں۔ اب ان میں سے عبادات والی لڑی آ رہی ہے اور زیر مطالعہ رکوع میں ''صوم'' کی عبادت کا تذکرہ ہے۔ جہاں تک ''صلوٰۃ'' (نماز) کا تعلق ہے تو اس کا ذکر مکی سورتوں میں بے تحاشا آیا ہے' لیکن مکی دور میں ''صوم'' کا بطور عبادت کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔

عربوں کے ہاں صوم یا صیام کے لفظ کا اطلاق اور مفہوم کیا تھا اور اس سے وہ کیا مراد لیتے تھے' اسے ذرا سمجھ لیجیے! عرب خود تو روزہ نہیں رکھتے تھے' البتہ اپنے گھوڑوں کو رکھواتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اکثر عربوں کا پیشہ غارت گری اور لوٹ مار تھا۔ پھر مختلف قبائل کے مابین وقفہ وقفہ سے جنگیں ہوتی رہتی تھیں۔ ان کاموں کے لیے ان کو گھوڑوں کی ضرورت تھی اور گھوڑا اس

مقصد کے لیے نہایت موزوں جانور تھا کہ اس پر بیٹھ کر تیزی سے جائیں' لوٹ مار کریں' شب خون ماریں اور تیزی سے واپس آ جائیں۔ اونٹ تیز رفتار جانور نہیں ہے' پھر وہ گھوڑے کے مقابلے میں تیزی سے اپنا رُخ بھی نہیں پھیر سکتا۔ مگر گھوڑا جہاں تیز رفتار جانور ہے' وہاں تنک مزاج اور نازک مزاج بھی ہے۔ چنانچہ وہ تربیت کے لیے ان گھوڑوں سے یہ مشقت کراتے تھے کہ ان کو بھوکا پیاسا رکھتے تھے اور ان کے مُنہ پر ایک ''توبڑا'' چڑھا دیتے تھے۔ اس عمل کو وہ ''صوم'' کہتے تھے اور جس گھوڑے پر یہ عمل کیا جائے اسے وہ ''صائم'' کہتے تھے' یعنی یہ روزہ سے ہے۔ اس طرح وہ گھوڑوں کو بھوک پیاس جھیلنے کا عادی بناتے تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مہم کے دوران گھوڑا بھوک پیاس برداشت نہ کر سکے اور جی ہار دے۔ اس طرح تو سوار کی جان شدید خطرے میں پڑ جائے گی اور اسے زندگی کے لالے پڑ جائیں گے! مزید یہ کہ عرب اس طور پر گھوڑوں کو بھوکا پیاسا رکھ کر موسم گرما اور لُو کی حالت میں انہیں لے کر میدان میں جا کھڑے ہوتے تھے۔ وہ اپنی حفاظت کے لیے اپنے سروں پر ڈھاٹے باندھ کر اور جسم پر کپڑے وغیرہ لپیٹ کر اُن گھوڑوں کی پیٹھ پر سوار رہتے تھے اور ان گھوڑوں کا مُنہ سیدھا لُو اور بادِ صرصر کے تھپیڑوں کی طرف رکھتے تھے' تاکہ اُن کے اندر بھوک پیاس کے ساتھ ساتھ لُو کے ان تھپیڑوں کو برداشت کرنے کی عادت بھی پڑ جائے' تاکہ کسی ڈاکے کی مہم یا قبائلی جنگ کے موقع پر گھوڑا سوار کے قابو میں رہے اور بھوک پیاس یا بادِ صرصر کے تھپیڑوں کو برداشت کر کے سوار کی مرضی کے مطابق مطلوبہ رُخ برقرار رکھے اور اس سے مُنہ نہ پھیرے۔ تو عرب اپنے گھوڑوں کو بھوکا پیاسا رکھ کر جو مشقت کراتے تھے اس پر وہ ''صوم'' کے لفظ یعنی روزہ کا اطلاق کرتے تھے۔

لیکن رسول اللہ ﷺ جب مدینہ تشریف لائے تو یہاں یہود کے ہاں روزہ رکھنے کا رواج تھا۔ وہ عاشورہ کا روزہ بھی رکھتے تھے' اس لیے کہ اس روز بنی اسرائیل کو فرعونیوں سے نجات ملی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو ابتداءً ہر مہینے ''ایامِ بیض'' کے تین روزے رکھنے کا حکم دیا۔ اس رکوع کی ابتدائی دو آیات میں غالباً اسی کی توثیق ہے۔ اگر ابتدا ہی میں پورے مہینے کے روزے فرض کر دیے جاتے تو وہ یقیناً شاق گزرتے۔ ظاہر بات ہے کہ مہینے سخت گرم بھی ہو سکتے ہیں۔ اب اگر تیس کے تیس روزے ایک ہی مہینے میں فرض کر دیے گئے ہوتے اور وہ جون جولائی کے ہوتے تو جان ہی تو نکل جاتی۔ چنانچہ بہترین تدبیر یہ کی گئی کہ ہر مہینے میں تین دن

کے روزے رکھنے کا حکم دیا گیا اور یہ روزے مختلف موسموں میں آتے رہے۔ پھر کچھ عرصے کے بعد رمضان کے روزے فرض کیے گئے۔ ہر مہینے میں تین دن کے روزوں کا جو ابتدائی حکم تھا اس میں علی الاطلاق یہ اجازت تھی کہ جو شخص یہ روزہ نہ رکھے وہ اس کا فدیہ دے' اگرچہ وہ بیمار یا مسافر نہ ہو اور روزہ رکھنے کی طاقت بھی رکھتا ہو۔ جب رمضان کے روزوں کی فرضیت کا حکم آ گیا تو اب یہ رخصت ختم کر دی گئی۔ البتہ رسول اللہ ﷺ نے فدیہ کی اس رخصت کو ایسے شخص کے لیے باقی رکھا جو بہت بوڑھا ہے' یا کسی ایسی سخت بیماری میں مبتلا ہے کہ روزہ رکھنے سے اس کے لیے جان کی ہلاکت کا اندیشہ ہو سکتا ہے۔ یہ ہے ان آیات کی تاویل جس پر میں بہت عرصہ پہلے پہنچ گیا تھا' لیکن چونکہ اکثر مفسرین نے یہ بات نہیں لکھی اس لیے میں اسے بیان کرنے سے جھجکتا رہا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ مولانا انور شاہ کاشمیریؒ کی رائے یہی ہے تو مجھے اپنی رائے پر اعتماد ہو گیا۔ پھر مجھے اس کا ذکر تفسیر کبیر میں امام رازیؒ کے ہاں بھی مل گیا کہ متقدمین کے ہاں یہ رائے موجود ہے کہ روزے سے متعلق پہلی دو آیتیں (۱۸۳'۱۸۴) رمضان کے روزے سے متعلق نہیں ہیں' بلکہ وہ ایامِ بیض کے روزوں سے متعلق ہیں۔ ایامِ بیض کے روزے رسول اللہ ﷺ نے رمضان کے روزوں کی فرضیت کے بعد بھی نفلاً رکھے ہیں۔

روزے کے احکام پر مشتمل یہ رکوع چھ آیتوں پر مشتمل ہے اور یہ اس اعتبار سے ایک عجیب مقام ہے کہ اس ایک جگہ روزے کا تذکرہ جامعیت کے ساتھ آ گیا ہے۔ قرآن مجید میں دیگر احکام بہت دفعہ آئے ہیں۔ نماز کے احکام بہت سے مقامات پر آئے ہیں۔ کہیں وضو کے احکام آئے ہیں تو کہیں تیمم کے' کہیں نمازِ قصر اور نمازِ خوف کا ذکر ہے۔ لیکن ''صوم'' کی عبادت پر یہ کل چھ آیات ہیں' جن میں اس کی حکمت' اس کی غرض و غایت اور اس کے احکام سب کے سب ایک جگہ آ گئے ہیں۔ فرمایا:

آیت ۱۸۳ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴾ ''اے ایمان والو! تم پر بھی روزہ رکھنا فرض کیا گیا ہے جیسے کہ فرض کیا گیا تھا تم سے پہلوں پر تاکہ تمہارے اندر تقویٰ پیدا ہو جائے''۔

وہ جنگ کے لیے گھوڑے کو تیار کرواتے تھے' تمہیں تقویٰ کے لیے اپنے آپ کو تیار کرنا ہے۔ روزے کی مشق تم سے اس لیے کرائی جا رہی ہے تاکہ تم بھوک کو قابو میں رکھ سکو' شہوت کو قابو میں رکھ سکو' پیاس کو برداشت کر سکو۔ تمہیں اللہ تعالیٰ کی راہ میں جنگ کے لیے نکلنا ہوگا' اس

میں بھوک بھی آئے گی' پیاس بھی آئے گی۔ اپنے آپ کو جہاد وقتال کے لیے تیار کرو۔ سورۃ البقرۃ کے اگلے رکوع سے قتال کی بحث شروع ہو جائے گی۔ چنانچہ روزے کی یہ بحث گویا قتال کے لیے بطور تمہید آ رہی ہے۔

آیت ۱۸۴ ﴿اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ؕ﴾ "گنتی کے چند دن ہیں۔"

"مَعْدُوْدٰت" جمع قلت ہے' جو تین سے نو تک کے لیے آتی ہے۔ یہ گویا اس کا ثبوت ہے کہ یہاں مہینے بھر کے روزے مراد نہیں ہیں۔

﴿فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ﴾ "اس پر بھی جو کوئی تم میں سے بیمار ہو یا سفر پر ہو'"

﴿فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ؕ﴾ "تو وہ تعداد پوری کر لے دوسرے دنوں میں۔"

﴿وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ؕ﴾ "اور جو اس کی طاقت رکھتے ہوں (اور وہ روزہ نہ رکھیں) اُن پر فدیہ ہے ایک مسکین کا کھانا کھلانا۔"

ان آیات کی تفسیر میں' جیسا کہ عرض کیا گیا' مفسرین کے بہت سے اقوال ہیں۔ میں نے اپنے مطالعے کے بعد جو رائے قائم کی ہے میں صرف وہی بیان کر رہا ہوں کہ اُس وقت امام رازیؒ کے بقول یہ فرضیت علی التّعیین نہیں تھی بلکہ علی التّخییر تھی۔ یعنی روزہ فرض تو کیا گیا ہے لیکن اس کا بدل بھی دیا جا رہا ہے کہ اگر تم روزہ رکھنے کی استطاعت کے باوجود نہیں رکھنا چاہتے تو ایک مسکین کو کھانا کھلا دو۔ چونکہ روزے کے وہ پہلے سے عادی نہیں تھے' لہٰذا انہیں تدریجاً اس کا خوگر بنایا جا رہا تھا۔

﴿فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ ؕ﴾ "اور جو اپنی مرضی سے کوئی خیر کرنا چاہے تو اس کے لیے خیر ہے۔"

اگر کوئی روزہ بھی رکھے اور مسکین کو کھانا بھی کھلائے تو یہ اس کے لیے بہتر ہوگا۔

﴿وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝﴾ "اور روزہ رکھو' یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم جانو۔"

یہاں بھی ایک طرح کی رعایت کا انداز ہے۔ یہ دو آیات ہیں جن میں میرے نزدیک روزے کا پہلا حکم دیا گیا' جس کے تحت رسول اللہ ﷺ اور اہل ایمان نے ہر مہینے میں تین دن

کے روزے رکھے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان روزوں کا حکم رسول اللہ ﷺ نے اہل ایمان کو اپنے طور پر دیا ہو اور بعد میں ان آیات نے اس کی توثیق کر دی ہو۔

اب وہ آیات آ رہی ہیں جو خاص رمضان کے روزے سے متعلق ہیں۔ ان میں سے دو آیات میں روزے کی حکمت اور غرض وغایت بیان کی گئی ہے۔ پھر ایک طویل آیت روزہ کے احکام پر مشتمل ہے اور آخر میں ایک آیت گویا لٹمس ٹیسٹ ہے۔

آیت ۱۸۵ ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ﴾ ''رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا''

﴿هُدًی لِّلنَّاسِ وَبَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰی وَالْفُرْقَانِ﴾ ''لوگوں کے لیے ہدایت بنا کر اور ہدایت اور حق و باطل کے درمیان امتیاز کی روشن دلیلوں کے ساتھ۔''

﴿فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْیَصُمْهُ﴾ ''تو جو کوئی بھی تم میں سے اس مہینے کو پائے (یا جو شخص بھی اس مہینے میں مقیم ہو) اس پر لازم ہے کہ روزہ رکھے۔''

اب وہ وجوب علی التخییر کا معاملہ ختم ہو گیا اور وجوب علی التعیین ہو گیا کہ یہ لازم ہے' یہ رکھنا ہے۔

﴿وَمَنْ كَانَ مَرِیْضًا اَوْ عَلٰی سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَ﴾ ''اور جو بیمار ہو یا سفر پر ہو تو وہ تعداد پوری کر لے دوسرے دنوں میں۔''

یہ رعایت حسب سابق برقرار رکھی گئی۔

﴿یُرِیْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ﴾ ''اللہ تمہارے ساتھ آسانی چاہتا ہے اور وہ تمہارے ساتھ سختی نہیں چاہتا۔''

لوگ خواہ مخواہ اپنے اوپر سختیاں جھیلتے ہیں' شدید سفر کے اندر بھی روزے رکھتے ہیں' حالانکہ اللہ تعالیٰ نے دوسرے دنوں میں گنتی پوری کرنے کی اجازت دی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک سفر میں ان لوگوں پر کافی سرزنش کی جنہوں نے روزہ رکھا ہوا تھا۔ آپؐ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ہمراہ جہاد و قتال کے لیے نکلے تھے کہ کچھ لوگوں نے اس سفر میں بھی روزہ رکھ لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سفر کے بعد جہاں منزل پر جا کر خیمے لگانے تھے وہ نڈھال ہو کر گر گئے اور جن لوگوں کا روزہ نہیں تھا انہوں نے خیمے لگائے۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((لَیْسَ مِنَ

الْبِرِّ الصَّوْمُ فِي السَّفَرِ)) (۱) ''سفر میں روزہ رکھنا کوئی نیکی کا کام نہیں ہے''۔ لیکن ہمارا نیکی کا تصور مختلف ہے۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ خواہ ۱۰۵ بخار چڑھا ہوا ہو وہ کہیں گے کہ روزہ تو میں نہیں چھوڑوں گا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی گئی رعایت سے فائدہ نہ اٹھانا ایک طرح کا کفرانِ نعمت ہے۔

﴿وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ﴾ ''تا کہ تم تعداد پوری کرو''

مرض یا سفر کے دوران جو روزے چھوٹ جائیں تمہیں دوسرے دنوں میں ان کی تعداد پوری کرنی ہوگی۔ وہ جو ایک رعایت تھی کہ فدیہ دے کر فارغ ہو جاؤ وہ اب منسوخ ہو گئی۔

﴿وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ﴾ ''اور تا کہ تم بڑائی کرو اللہ کی اس پر جو ہدایت اُس نے تمہیں بخشی ہے''

﴿ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴾ ''اور تا کہ تم شکر کر سکو''۔

وہ نعمتِ عظمیٰ جو قرآن حکیم کی شکل میں تمہیں دی گئی ہے' تم اس کا شکر ادا کرو۔ اس موضوع پر میرے دو کتابچوں ''عظمتِ صوم'' اور ''عظمتِ صیام و قیامِ رمضانِ مبارک'' کا مطالعہ مفید ثابت ہوگا۔ ان میں یہ سارے مضامین تفصیل سے آئے ہیں کہ روزے کی کیا حکمت ہے' کیا غرض و غایت ہے' کیا مقصد ہے اور آخری منزل کیا ہے۔ مطلوب تو یہ ہے کہ تمہارا یہ جو جسمِ حیوانی ہے' یہ کچھ کمزور پڑے اور روحِ ربانی جو تم میں پھونکی گئی ہے اسے تقویت حاصل ہو۔ چنانچہ دن میں روزہ رکھو اور اس حیوانی وجود کو ذرا کمزور کرو' اس کے تقاضوں کو دباؤ۔ پھر راتوں کو کھڑے ہو جاؤ اور اللہ کا کلام سنو اور پڑھو' تا کہ تمہاری روح کی آبیاری ہو' اس پر آبِ حیات کا ترشح ہو۔ نتیجہ یہ نکلے گا کہ خود تمہارے اندر سے تقرب الی اللہ کی ایک پیاس ابھرے گی۔

آیت ۱۸۶ ﴿وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ﴾ ''اور (اے نبی ﷺ!) جب میرے بندے آپ سے میرے بارے میں سوال کریں تو (ان کو بتا دیجیے کہ) میں قریب ہوں''۔

میرے نزدیک یہ دنیا میں حقوقِ انسانی کا سب سے بڑا منشور (Magna Carta)

(۱) صحیح البخاری' کتاب الصوم' باب قول النبی ﷺ لمن ظلل علیه واشتد الحر لَيْسَ مِنَ الْبِرِّ الصَّوْمُ فِي السَّفَرِ۔ واللفظ له۔ وفی روایة المسلم: ((لَيْسَ مِنَ الْبِرِّ اَنْ تَصُوْمُوْا فِي السَّفَرِ)) کتاب الصیام' باب جواز السفر والفطر فی شهر رمضان للمسافر......

ہے کہ اللہ اور بندے کے درمیان کوئی فصل نہیں ہے۔ فصل اگر ہے تو وہ تمہاری اپنی خباثت ہے۔ اگر تمہاری نیت میں فساد ہے کہ حرام خوری تو کرنی ہی کرنی ہے تو اب کس منہ سے اللہ سے دعا کرو گے؟ لہٰذا کسی پیر کے پاس جاؤ گے کہ آپ دعا کر دیجیے' یہ نذرانہ حاضر ہے۔ بندے اور خدا کے درمیان خود انسان کا نفس حائل ہے اور کوئی نہیں' ورنہ اللہ تعالیٰ کا معاملہ تو یہ ہے کہ: ؎

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں
راہ دکھلائیں کسے' راہ روِ منزل ہی نہیں!

اُس تک پہنچنے کا واسطہ کوئی پوپ نہیں' کوئی پادری نہیں' کوئی پنڈت نہیں' کوئی پروہت نہیں' کوئی پیر نہیں۔ جب چاہو اللہ سے ہم کلام ہو جاؤ۔ علامہ اقبال نے کیا خوب کہا ہے: ؎

کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے؟
پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو!

اللہ تعالیٰ نے واضح فرما دیا ہے کہ میرا ہر بندہ جب چاہے' جہاں چاہے مجھ سے ہم کلام ہو سکتا ہے۔

﴿اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ﴾ ''میں تو ہر پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں جب بھی (اور جہاں بھی) وہ مجھے پکارے''

''اجابت'' کے مفہوم میں کسی کی پکار کا سننا' اس کا جواب دینا اور اسے قبول کرنا' یہ تینوں چیزیں شامل ہیں۔ لیکن اس کے لیے ایک شرط عائد کی جا رہی ہے:

﴿فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ﴾ ''پس انہیں چاہیے کہ وہ میرا حکم مانیں''
﴿وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ﴾ ''اور مجھ پر ایمان رکھیں''

یہ یک طرفہ بات نہیں ہے' بلکہ یہ دو طرفہ معاملہ ہے۔ جیسے ہم پڑھ چکے ہیں: ﴿فَاذْكُرُوْنِیْٓ اَذْكُرْكُمْ﴾ ''پس تم مجھے یاد رکھو میں تمہیں یاد رکھوں گا'' تم میرا شکر کرو گے تو میں تمہاری قدر دانی کروں گا۔ تم میری طرف چل کر آؤ گے تو میں دوڑ کر آؤں گا۔ تم بالشت بھر آؤ گے تو میں ہاتھ بھر آؤں گا۔ لیکن اگر تم رُخ موڑ لو گے تو ہم بھی رُخ موڑ لیں گے۔ ہماری تو کوئی غرض نہیں ہے' غرض تو تمہاری ہے۔ تم رجوع کرو گے تو ہم بھی رجوع کریں گے۔ تم توبہ کرو گے تو ہم اپنی نظر کرم تم پر متوجہ کر دیں گے۔ سورۂ محمدؐ میں الفاظ آئے ہیں: ﴿اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ یَنْصُرْكُمْ﴾ (آیت ۷) ''اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا''۔ لیکن اگر تم اللہ

کے دشمنوں کے ساتھ دوستی کی پینگیں بڑھاؤ' ان کے ساتھ تمہاری ساز باز ہو اور کھڑے ہو جاؤ قنوتِ نازلہ میں اللہ سے مدد مانگنے کے لیے تو تم سے بڑا بے وقوف کون ہوگا؟ پہلے اللہ کی طرف اپنا رُخ تو کرو' اللہ سے اپنا معاملہ تو درست کرو۔ اس میں یہ کوئی شرط نہیں ہے کہ پہلے ولی کامل بن جاؤ' بلکہ اُسی وقت خلوصِ نیت سے توبہ کرو' سارے پردے ہٹ جائیں گے۔ آیت کے آخر میں فرمایا:

﴿لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ﴾ ''تاکہ وہ صحیح راہ پر رہیں۔''

اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھنے اور اس کے احکام پر چلنے کا یہ نتیجہ نکلے گا کہ وہ رشد و ہدایت کی راہ پر گامزن ہو جائیں گے۔

آیت ۱۸۷ ﴿اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ﴾ ''حلال کر دیا گیا ہے تمہارے لیے روزے کی راتوں میں بے حجاب ہونا اپنی بیویوں سے۔''

احکامِ روزہ سے متعلق یہ آیت بڑی طویل ہے۔ یہود کے ہاں شریعت موسوی میں روزہ شام کو ہی شروع ہو جاتا تھا اور رات بھی روزے میں شامل تھی۔ چنانچہ تعلق زن و شو بھی قائم نہیں ہو سکتا تھا۔ ان کے ہاں سحری وغیرہ کا بھی کوئی تصور نہیں تھا۔ جیسے ہی رات کو سوتے روزہ شروع ہو جاتا اور اگلے دن غروبِ آفتاب تک روزہ رہتا۔ ہمارے ہاں روزے میں نرمی کی گئی ہے۔ ایک تو یہ کہ رات کو روزے سے خارج کر دیا گیا۔ روزہ بس دن کا ہے اور رات کے وقت روزے کی ساری پابندیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ رات کو تعلق زن و شو بھی قائم کیا جا سکتا ہے اور کھانے پینے کی بھی اجازت ہے۔ لیکن بعض مسلمان یہ سمجھ رہے تھے کہ شاید ہمارے ہاں بھی روزے کے وہی احکام ہیں جو یہود کے ہاں ہیں۔ اس لیے ایسا بھی ہوتا تھا کہ روزوں کی راتوں میں بعض لوگ جذبات میں بیویوں سے مقاربت کر لیتے تھے' لیکن دل میں سمجھتے تھے کہ شاید ہم نے غلط کام کیا ہے۔ یہاں اب ان کو اطمینان دلایا جا رہا ہے کہ تمہارے لیے روزے کی راتوں میں اپنی بیویوں کے پاس جانا حلال کر دیا گیا ہے۔

﴿هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ﴾ ''وہ پوشاک ہیں تمہارے لیے اور تم پوشاک ہو اُن کے لیے۔''

یہ بڑا لطیف کنایہ ہے کہ وہ تمہارے لیے بمنزلہ لباس ہیں اور تم ان کے لیے بمنزلہ لباس ہو۔ جیسے لباس میں اور جسم میں کوئی پردہ نہیں ایسے ہی بیوی میں اور شوہر میں کوئی پردہ نہیں ہے۔

خود لباس ہی تو پردہ ہے۔ ویسے بھی مرد کے اخلاق کی حفاظت کرنے والی بیوی ہے اور بیوی کے اخلاق کی حفاظت کرنے والا مرد ہے۔ مجھے اقبال کا شعر یاد آ گیا:

نے پردہ نہ تعلیم ' نئی ہو کہ پرانی
نسوانیتِ زن کا نگہباں ہے فقط مرد

بہر حال مرد و عورت ایک دوسرے کے لیے ایک ضرورت بھی ہیں اور ایک دوسرے کی پردہ پوشی بھی کرتے ہیں۔

﴿عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ﴾ ''اللہ کے علم میں ہے کہ تم اپنے آپ کے ساتھ خیانت کر رہے تھے''

تم ایک کام کر رہے تھے جو گناہ نہیں ہے' لیکن تم سمجھتے تھے کہ گناہ ہے' پھر بھی اس کا ارتکاب کر رہے تھے۔ اس طرح تم اپنے آپ سے خیانت کے مرتکب ہو رہے تھے۔

﴿فَتَابَ عَلَيْكُمْ﴾ ''تو اللہ نے تم پر نظر رحمت فرمائی''

﴿وَعَفَا عَنْكُمْ﴾ ''اور تمہیں معاف کر دیا۔''

اس سلسلے میں جو بھی خطائیں ہوگئی ہیں وہ سب کی سب معاف سمجھو۔

﴿فَالْئٰنَ بَاشِرُوْهُنَّ﴾ ''تو اب تم ان کے ساتھ تعلق زن و شو قائم کرو''

﴿وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ﴾ ''اور تلاش کرو اس کو جو کچھ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے لکھ دیا ہے۔''

یعنی اولاد' جو تعلق زن و شو کا اصل مقصد ہے۔ دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس تعلق زن و شو کو سکون و راحت کا ذریعہ بنایا ہے۔ جیسے قرآن مجید میں ﴿لِتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا﴾ کے الفاظ آئے ہیں۔ اس تعلق کے بعد اعصاب کے تناؤ میں ایک سکون کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اس میں یہی حکمت ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنے ہر سفر میں ایک زوجہ محترمہ کو ضرور ساتھ رکھتے تھے۔ اس لیے کہ قائد اور سپہ سالار کو کسی وقت کسی ایسی پریشان کن صورت حال میں فیصلے کرنے پڑتے ہیں کہ جذبات پر اور اعصاب پر دباؤ ہوتا ہے۔

﴿وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ﴾ ''اور کھاؤ پیو یہاں تک کہ واضح ہو جائے تمہارے لیے فجر کی سفید دھاری (رات کی) سیاہ دھاری سے۔''

یہ پو پھٹنے کے لیے استعارہ ہے۔ یعنی جب سپیدۂ سحر نمایاں ہوتا ہے' صبح صادق ہوتی ہے اُس وقت تک کھانے پینے کی چھوٹ ہے۔ بلکہ یہاں ﴿وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا﴾ "اور کھاؤ اور پیو" امر کے صیغے آئے ہیں۔ سحری کرنے کی حدیث میں بھی تاکید آئی ہے اور رسول اللہ ﷺ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ ہمارے اور یہود کے روزے کے مابین سحری کا فرق ہے۔ ایک حدیث میں آیا ہے: ((تَسَحَّرُوْا فَاِنَّ فِی السَّحُوْرِ بَرَكَةً)) (۱) "سحری ضرور کیا کرو' اس لیے کہ سحری میں برکت ہے"۔

﴿ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ﴾ "پھر رات تک روزے کو پورا کرو۔"

"رات تک" سے اکثر فقہاء کے نزدیک غروبِ آفتاب مراد ہے۔ اہلِ تشیع اس سے ذرا آگے جاتے ہیں کہ غروبِ آفتاب پر چند منٹ مزید گزر جائیں۔

﴿وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ فِی الْمَسٰجِدِ﴾ "اور ان سے مباشرت مت کرو جبکہ تم مسجدوں میں حالتِ اعتکاف میں ہو۔"

یہ رعایت جو تمہیں دی جا رہی ہے اس میں ایک استثناء ہے کہ جب تم مسجدوں میں معتکف ہو تو پھر اپنی بیویوں سے رات کے دوران بھی کوئی تعلق قائم نہ کرو۔

﴿تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا﴾ "یہ اللہ کی (مقرر کی ہوئی) حدود ہیں' پس ان کے قریب بھی مت جاؤ۔"

بعض مقامات پر آتا ہے: ﴿تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا﴾ "یہ اللہ کی مقرر کردہ حدود ہیں' پس ان سے تجاوز نہ کرو' ان کو عبور نہ کرو۔ اصلاً حرام تو وہی شے ہوگی کہ حدود سے تجاوز کیا جائے۔ لیکن بہرحال احتیاط اس میں ہے کہ ان حدود سے دور رہا جائے (to keep at a safe distance) آخری حد تک چلے جاؤ گے تو اندیشہ ہے کہ کہیں اس حد کو عبور نہ کر جاؤ۔

﴿كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ﴾ "اسی طرح اللہ واضح کرتا ہے اپنی نشانیاں لوگوں کے لیے"

﴿لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ﴾ "تا کہ وہ تقویٰ کی روش اختیار کر سکیں۔"

(۱) صحیح البخاری' کتاب الصوم' باب برکة السحور من غیر ایجاب۔ وصحیح مسلم' کتاب الصیام' باب فضل السحور ......

اب اس رکوع کی آخری آیت میں بتایا جا رہا ہے کہ تقویٰ کا معیار اور اس کی کسوٹی کیا ہے۔ روزہ اس لیے فرض کیا گیا ہے اور یہ سارے احکام تمہیں اسی لیے دیے جا رہے ہیں تا کہ تم میں تقویٰ پیدا ہو جائے ——— اور تقویٰ کا لٹمس ٹیسٹ ہے ''اکلِ حلال''۔ اگر یہ نہیں ہے تو کوئی نیکی نیکی نہیں ہے۔ فرمایا:

آیت ۱۸۸ ﴿وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ﴾ ''اور تم اپنے مال آپس میں باطل طریقوں سے ہڑپ نہ کرو''

﴿وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ﴾ ''اور اس کو ذریعہ نہ بناؤ حکام تک پہنچنے کا''

﴿لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ﴾ ''تا کہ تم لوگوں کے مال کا کچھ حصہ ہڑپ کر سکو گناہ کے ساتھ''

﴿وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾ ''اور تم اس کو جانتے بوجھتے کر رہے ہو۔''

یہ تقویٰ کے لیے معیار اور کسوٹی ہے۔ جو شخص اکلِ حلال پر قانع ہو گیا اور حرام خوری سے بچ گیا وہ متقی ہے۔ ورنہ نمازوں اور روزوں کے انبار کے ساتھ ساتھ جو شخص حرام خوری کی روش اختیار کیے ہوئے ہے وہ متقی نہیں ہے۔ میں حیران ہوتا ہوں کہ لوگوں نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ احکام کی آیات کے درمیان یہ آیت کیونکر آئی ہے۔ اس سے پہلے روزے کے احکام آئے ہیں' آگے حج کے احکام آ رہے ہیں' پھر قتال کے احکام آئیں گے۔ ان کے درمیان میں اس آیت کی کیا حکمت ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ جیسے روزے کی حکمت کا نقطۂ عروج یہ ہے کہ روحِ انسانی میں تقرب الی اللہ کی طلب پیدا ہو جائے اسی طرح احکامِ صوم کا نقطۂ عروج ''اکلِ حلال'' ہے۔

❁❁❁

فرمانِ نبوی ﷺ

خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهُ

''تم میں سے بہترین وہ ہے جو قرآن سیکھے اور اسے سکھائے''

(رواہ البخاری' عن عثمان بن عفان ؓ)

ترجمۂ قرآن مجید

مع صرفی و نحوی تشریح

افادات: حافظ احمد یار مرحوم

ترتیب و تدوین: لطف الرحمٰن خان

سورۃ البقرۃ (مسلسل)

آیت ۲۵۹

﴿اَوْ كَالَّذِيْ مَرَّ عَلٰى قَرْيَةٍ وَّهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا ۚ قَالَ اَنّٰى يُحْيٖ
هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ۭ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ۭ قَالَ
لَبِثْتُ يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ۭ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ
وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ ۚ وَانْظُرْ اِلٰى حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَانْظُرْ اِلَى
الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا ۭ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗ ۙ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ
عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴾

خ و ی

خَوٰی (ض) خَوَاءً: اوندھا ہونا' منہدم ہونا۔

خَاوِيَةٌ (اسم الفاعل خَاوٍ کا مؤنث): اوندھی ہونے والی' یعنی اوندھی۔ آیتِ زیرِ مطالعہ۔

ع ر ش

عَرَشَ (ض) عَرْشًا: کسی چیز پر چھپر یا چھت ڈالنا۔ ﴿وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ

فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهٗ وَمَا كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ﴾ (الاعراف) ''اور ہم نے برباد کیا اس کو جو بنایا کرتے تھے فرعون اور اس کی قوم' اور اس کو جو وہ لوگ چھت ڈالا کرتے تھے۔''

عَرْشٌ ج عُرُوْشٌ (اسم ذات) : چھپر' چھت' تخت (کیونکہ یہ زمین سے اونچا ہوتا ہے)۔ ﴿وَرَفَعَ اَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ﴾ (یوسف: ١٠٠) ''اور اُس نے اٹھایا اپنے والدین کو تخت پر۔'' ﴿وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ﴾ (التوبة) ''اور وہ عظیم عرش کا مالک ہے۔''

مَعْرُوْشٌ (اسم المفعول) : چھپر یا چھت ڈالا ہوا۔ ﴿وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَ جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ وَّغَيْرَ مَعْرُوْشٰتٍ﴾ (الانعام: ١٤١) ''اور وہ ہے جس نے پیدا کیا باغات کو' چھپر ڈالے ہوئے اور بغیر چھپر ڈالے ہوئے۔''

ل ب ث

لَبِثَ (س) لَبْثًا : کسی جگہ قیام کرنا' ٹھہرنا۔ آیت زیر مطالعہ۔

لَابِثٌ (اسم الفاعل) : ٹھہرنے والا۔ ﴿لّٰبِثِيْنَ فِيْهَآ اَحْقَابًا﴾ (النبأ) ''قیام کرنے والے ہیں اس میں مدتوں۔''

تَلَبَّثَ (تفعّل) تَلَبُّثًا : بتکلف ٹھہرنا' یعنی دیر کرنا۔ ﴿وَمَا تَلَبَّثُوْا بِهَآ اِلَّا يَسِيْرًا﴾ (الاحزاب) ''اور وہ لوگ دیر نہیں کریں گے اس میں مگر تھوڑی سی۔''

س ن ھ

سَنِهَ (س) سَنَهًا : بہت سالوں والا ہونا' متغیر ہونا' بگڑ جانا (مدت گزرنے کی وجہ سے)۔

تَسَنَّهَ (تفعّل) تَسَنُّهًا : متغیر ہونا' خراب ہونا۔ آیت زیر مطالعہ۔

ح م ر

حَمَرَ (ن) حَمْرًا : کھال کھرچنا (جس سے سرخی ظاہر ہو جائے)۔

اَحْمَرُ مؤنث حَمْرَاءُ ج حُمْرٌ : (افعل الوان وعیوب ہے) سرخ رنگ والا۔ ﴿وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌۢ بِيْضٌ وَّحُمْرٌ﴾ (فاطر: ٢٧) ''اور پہاڑوں میں سرخ و سفید راستے ہیں۔''

حِمَارٌ ج حُمُرٌ اور حَمِيْرٌ (اسم ذات) : گدھا۔ ﴿كَاَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنْفِرَةٌ﴾ (المدثر) ''گویا وہ لوگ بدکے ہوئے گدھے ہیں۔'' ﴿اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ﴾ (لقمان) ''بے شک سب سے بری آواز گدھوں کی آواز ہے۔''

ن ش ز

نَشَزَ (ن) نَشْزًا : کسی چیز کا اپنی جگہ سے اُبھرنا' اُوپر اُٹھنا۔

نُشُوْزًا : بدخو یا بدکلام ہونا' زیادتی کرنا۔

اُنْشُزْ (فعل امر) : تو ابھر' تو اُٹھ۔ ﴿وَاِذَا قِيْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا﴾ (المُجادلة:١١)

''اور جب کہا جائے کہ تم لوگ اٹھو تو تم لوگ اٹھ جاؤ۔''

نُشُوْزٌ (اسم ذات) : بدخوئی' زیادتی۔ ﴿وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْ بَعْلِهَا نُشُوْزًا﴾ (النّساء:١٢٨) ''اور اگر کسی عورت کو خوف ہو اپنے شوہر سے زیادتی کا۔''

اَنْشَزَ (افعال) اِنْشَازًا : کسی کو اس کی جگہ سے اٹھانا۔ آیت زیر مطالعہ۔

ترکیب : ''اَوْ'' گزشتہ آیت کے ''اَلَمْ تَرَ'' پر عطف ہے۔ پورا جملہ اس طرح ہو گا: ''اَوْ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْ كَانَ كَالَّذِيْ'' ۔ ''وَهِيَ'' کا ''وَاوْ'' حالیہ ہے۔ ''يُحْيِ'' کا مفعول ''هٰذِهٖ'' ہے۔ ''مِائَةَ عَامٍ'' ظرف ہے اس لیے ''مِائَةَ'' منصوب ہے۔ ''كَمْ لَبِثْتَ'' میں ''كَمْ'' کی تمیز محذوف ہے جو ''يَوْمًا'' یا ''عَامًا'' ہو سکتی ہے۔ طعام اور شراب کے لیے تثنیہ کا صیغہ آنا چاہیے تھا' لیکن ''لَمْ يَتَسَنَّهْ'' واحد آیا ہے۔ اس کی وضاحت آگے نوٹ میں کی جائے گی۔ یہ دراصل ''يَتَسَنَّهُ'' تھا جو ''لَمْ'' کی وجہ سے مجزوم ہوا ہے۔ ''لِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ'' درمیان میں جملۂ معترضہ ہے۔ ''اِلَى الْعِظَامِ'' گزشتہ جملہ کے ''حِمَارِكَ'' پر عطف ہے۔ ''نُنْشِزُهَا'' اور ''نَكْسُوْهَا'' کی ضمائر مفعولی ''اَلْعِظَامِ'' کے لیے ہیں' جبکہ ''نَكْسُوْ'' کا مفعول ثانی ''لَحْمًا'' ہے۔ اور ''نَحْنُ'' ضمیر جو اِن میں چھپی ہوئی ہے' ان کی فاعل ہے جو اللہ کے لیے ہے۔

ترجمہ:

اَوْ : یا	كَالَّذِيْ : اس کی مانند جو
مَرَّ : گزرا	عَلٰى قَرْيَةٍ : ایک بستی پر
وَّ : اس حال میں کہ	هِيَ : وہ
خَاوِيَةٌ : اوندھی تھی	عَلٰى عُرُوْشِهَا : اپنی چھتوں پر
قَالَ : اس نے کہا	اَنّٰى : کس طرح سے
يُحْيِ : زندہ کرے گا	هٰذِهِ : اس کو

اَللّٰهُ :اللہ
فَاَمَاتَهُ : تو موت دی اس کو
مِائَةَ عَامٍ :ایک سو سال (کے لیے)
بَعَثَهٗ :اس نے اٹھایا اس کو
كَمْ :کتنا (عرصہ)
قَالَ :اس نے کہا
يَوْمًا :ایک دن
قَالَ :(اللہ نے) کہا
لَّبِثْتَ :تو ٹھہرا
فَانْظُرْ :پس تو دیکھ
وَشَرَابِكَ :اور اپنی پینے کی چیز کی طرف
وَانْظُرْ :اور تو دیکھ
وَلِنَجْعَلَكَ :اور (یہ) اس لیے کہ ہم بنائیں تجھ کو
لِّلنَّاسِ :لوگوں کے لیے
اِلَى الْعِظَامِ :ہڈیوں کی طرف
نُنْشِزُهَا :ہم اٹھاتے ہیں ان کو
نَكْسُوْهَا :ہم پہناتے ہیں ان کو
فَلَمَّا :پس جب
لَهٗ :اس کے لیے
اَعْلَمُ : میں جانتا ہوں
عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ :ہر چیز پر

بَعْدَ مَوْتِهَا :اس کی موت کے بعد
اللّٰهُ :اللہ نے
ثُمَّ :پھر
قَالَ :(اللہ نے) کہا
لَبِثْتَ :تو ٹھہرا
لَبِثْتُ :میں ٹھہرا
اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ :یا ایک دن کا کچھ (حصہ)
بَلْ :بلکہ
مِائَةَ عَامٍ :ایک سو سال
اِلٰى طَعَامِكَ :اپنی خوراک کی طرف
لَمْ يَتَسَنَّهْ :وہ متغیر ہی نہیں ہوئی
اِلٰى حِمَارِكَ :اپنے گدھے کی طرف
اٰيَةً :ایک نشانی
وَانْظُرْ :اور تو دیکھ
كَيْفَ :کیسے
ثُمَّ :پھر
لَحْمًا :گوشت
تَبَيَّنَ :واضح ہوا
قَالَ :(تو) اس نے کہا
اَنَّ اللّٰهَ :کہ اللہ
قَدِيْرٌ :قدرت رکھنے والا ہے

نوٹ (۱) : اردو میں ہم کہتے ہیں ''دودھ اور دہی کا ذائقہ خراب نہیں ہوا''۔ حالانکہ گرامر کے لحاظ سے کہنا چاہیے تھا ''ذائقے خراب نہیں ہوئے''۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بات

کہنے کا یہ انداز عربی سے لیا گیا ہے' کیونکہ عربی میں کبھی واحد بول کر تثنیہ اور کبھی تثنیہ بول کر واحد مراد لیتے ہیں۔ اس آیت میں بھی یہی انداز ہے کہ ''لَمْ يَتَسَنَّهْ'' واحد بول کر تثنیہ مراد لیا گیا ہے۔ اس حوالے سے ''آسان عربی گرامر'' کے ''ابتدائیہ'' میں بتائی گئی اس بات کو ذہن میں تازہ کرلیں کہ زبان پہلے وجود میں آتی ہے اور قواعد بعد میں مرتب کیے جاتے ہیں۔ اس لیے گرامر اہل زبان کے تابع ہوتی ہے' لیکن اہل زبان گرامر کے پابند نہیں ہوتے۔

نوٹ (۲) : ''يَتَسَنَّهْ'' کے مادے کے بارے میں اختلافِ رائے ہے۔ ایک رائے یہ ہے کہ اس کا مادہ ''س ن ہ'' ہے۔ حافظ احمد یار صاحب مرحوم نے اسی رائے کو ترجیح دی ہے اور ہم نے بھی اسے ہی اختیار کیا ہے۔

دوسری رائے یہ ہے کہ اس کا مادہ ''س ن ن'' ہے۔ باب تفعّل میں اس کا مضارع ''يَتَسَنَّنُ'' بنتا ہے۔ یہ قاعدہ آپ پڑھ چکے ہیں کہ کسی لفظ میں ایک ہی حرف دو دفعہ آ جائے تو عام طور پر اُن کا اِدغام کر دیتے ہیں۔ اب یہ قاعدہ بھی نوٹ کرلیں کہ ایک ہی حرف اگر تین دفعہ آ جائے تو پہلے دو حروف کا اِدغام کر کے تیسرے حرف کو ''ی'' میں تبدیل کر سکتے ہیں' یعنی یہ قاعدہ اختیاری ہے۔ اس طرح ''يَتَسَنَّنُ'' تبدیل ہو کر ''يَتَسَنّٰى'' ہو گیا' پھر اس پر ''لَمْ'' داخل ہوا تو ''ی'' گر گئی اور ''لَمْ يَتَسَنَّ'' باقی بچا۔ اس کے آگے جو ہائے ساکن ہے اسے ہائے سکت کہتے ہیں۔ اس کو وقف کے لیے لگاتے ہیں اور اس کے کوئی معنی نہیں ہوتے۔ جیسے كِتٰبِيَهْ ' حِسَابِيَهْ وغیرہ۔ (الحاقۃ: ۱۹' ۲۰)۔

آیت ۲۶۰

﴿وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى ۭ قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ۭ قَالَ بَلٰي وَلٰكِنْ لِّيَطْمَىِٕنَّ قَلْبِيْ ۭ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْھُنَّ اِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰي كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَاْتِيْنَكَ سَعْيًا ۭ وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۶۰﴾﴾

<u>ط م ء ن</u>

طَمْأَنَ (رُباعی) طَمْأَنَةً : ذہن کو خلجان سے خالی کرنا' پُرسکون کرنا' مطمئن کرنا۔

اِطْمَأَنَّ (اِفْعِلْ لَالٌ) اِطْمِئْنَانًا : ذہن کا خلجان سے خالی ہو جانا' پُرسکون ہو جانا۔ آیت

زیر مطالعہ۔

مُطْمَئِنٌّ (اسم الفاعل) : پرسکون ہو جانے والا۔ ﴿اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّ بِالْاِيْمَانِ﴾ (النحل:١٠٦) ''سوائے اس کے جو مجبور کیا گیا اس حال میں کہ اس کا دل مطمئن ہو جانے والا ہے ایمان پر۔''

ط ی ر

طَارَ (ض) طَيْرًا : کسی چیز کا اڑنا' پھیل جانا۔ ﴿وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ﴾ (الانعام:٣٨) ''اور نہ کوئی پرندہ جو اڑتا ہے اپنے پروں کے ساتھ۔''

طَائِرٌ ج طَيْرٌ (اسم الفاعل) : اُڑنے والا۔ مختلف مفاہیم میں آتا ہے: (١) پرندہ۔ مذکورہ بالا آیت (الانعام:٣٨) دیکھیں۔ (٢) اعمال (کیونکہ عمل کر لینے کے بعد وہ انسان کے ہاتھ سے نکل جاتے ہیں' یعنی اڑ جاتے ہیں)۔ ﴿وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ﴾ (الاسراء:١٣) ''اور ہر ایک انسان' ہم نے لازم کیا اس پر اس کا عمل اس کی گردن میں۔'' (٣) بدشگونی' نحوست (عرب لوگ پرندوں سے شگون لیا کرتے تھے۔ پھر یہ شگون کے بجائے بدشگونی کے لیے استعمال ہونے لگا)۔ ﴿قَالُوْا طٰٓئِرُكُمْ مَّعَكُمْ﴾ (یٰسٓ:١٩) ''انہوں نے کہا تمہاری نحوست تمہارے ساتھ ہے۔''

تَطَيَّرَ (تفعّل) تَطَيُّرًا : بدشگونی لینا' منحوس سمجھنا۔ ﴿قَالُوْٓا اِنَّا تَطَيَّرْنَا بِكُمْ﴾ (یٰسٓ:١٨) ''انہوں نے کہا بے شک ہم تم لوگوں کو منحوس سمجھتے ہیں۔''

اِسْتَطَارَ (استفعال) اِسْتِطَارَةً : پھیل جانا' منتشر ہونا۔

مُسْتَطِيْرٌ (اسم الفاعل) : پھیل جانے والا۔ ﴿وَيَخَافُوْنَ يَوْمًا كَانَ شَرُّهٗ مُسْتَطِيْرًا﴾ (الدھر) ''اور وہ لوگ خوف کرتے ہیں اس دن کا ہوگا جس کا شر پھیل جانے والا۔''

ص و ر

صَارَ (ن) صَوْرًا: (١) بلانا' مائل کرنا۔ (٢) کاٹنا' مجسمہ تراشنا۔

صُرْ (فعل امر) : تو مائل کر۔ آیت زیر مطالعہ۔

صُوْرَةٌ ج صُوَرٌ (اسم ذات) : شکل' حلیہ' صورت۔ ﴿فِيْٓ اَيِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ﴾ (الانفطار) ''جیسی شکل میں اس نے چاہا' اس نے ترتیب دیا تجھ کو۔'' ﴿فَاَحْسَنَ

صُوَرَكُمْ﴾ (المؤمن:٦٤) ''تو اُس نے اچھی بنائیں تمہاری شکلیں۔''

صُوْرٌ (اسم ذات) : ہر وہ چیز جس میں پھونکنے سے آواز پیدا ہو' جیسے بگل' سائرن وغیرہ۔ ﴿يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ ۭ﴾ (الانعام:٧٣) ''جس دن پھونکا جائے گا صور میں۔''

صَوَّرَ (تفعیل) تَصْوِيْرًا : کسی کو کوئی شکل یا حلیہ دینا۔ ﴿هُوَ الَّذِيْ يُصَوِّرُكُمْ فِي الْاَرْحَامِ كَيْفَ يَشَاۗءُ ۭ﴾ (آل عمران:٦) ''وہ ہے جو شکل دیتا ہے تم لوگوں کو رحموں میں جیسی وہ چاہتا ہے۔''

مُصَوِّرٌ (اسم الفاعل) : شکل دینے والا۔ ﴿هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ﴾ (الحشر:٢٤) ''وہ اللہ ہے جو پیدا کرنے والا ہے' وجود بخشنے والا ہے' شکل دینے والا ہے۔''

ج ب ل

جَبَلَ (ن) جَبْلاً : بنانا' جیسے مٹی میں پانی ڈال کر گارا بنانا۔

جِبِلَّةٌ ج جِبِلٌّ (اسم ذات) : بنائی ہوئی چیز' خلقت۔ (جِبِلَّةٌ اسم جمع ہے اور اس کی جمع بھی آتی ہے)۔ ﴿وَاتَّقُوا الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالْجِبِلَّةَ الْاَوَّلِيْنَ﴾ (الشعراء) ''اور تم لوگ تقویٰ اختیار کرو اس کا جس نے پیدا کیا تم لوگوں کو اور پہلی خلقت کو۔'' ﴿وَلَقَدْ اَضَلَّ مِنْكُمْ جِبِلًّا كَثِيْرًا ۭ﴾ (یٰس:٦٢) ''اور اس نے گمراہ کیا تم میں سے بہت سی خلقتوں کو۔''

جَبَلٌ ج جِبَالٌ: پہاڑ۔ ﴿وَكَانُوْا يَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا﴾ (الحجر:٨٢) ''اور وہ لوگ تراشتے تھے پہاڑوں میں سے گھر۔''

ج ز ء

جَزَءَ (ف) جَزْءًا : کسی چیز کو ٹکڑوں میں تقسیم کرنا۔

جُزْءٌ (اسم ذات) : ٹکڑا' حصہ۔ آیت زیر مطالعہ۔

ترکیب : ''رَبِّ'' کی جر یائے متکلم کی علامت ہے' یعنی یہ دراصل ''رَبِّیْ'' تھا۔ ''اَرِ'' فعل امر ہے' ''نِیْ'' ضمیر مفعولی ہے اور آگے ''كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى'' پورا جملہ اس کا مفعول ثانی ہے۔ ''لِيَطْمَئِنَّ'' سے پہلے ''سَئَلْتُكَ'' محذوف ہے۔ ''فَخُذْ'' کا مفعول ''مِنَ الطَّيْرِ'' ہے اور محلاً منصوب ہے' جبکہ ''اَرْبَعَةً'' تمیز ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ ''اِجْعَلْ'' کا مفعول ''جُزْءًا'' ہے جبکہ ''مِنْهُنَّ'' اس سے متعلق ہے۔ ''طَيْرٌ'' غیر عاقل کی جمع ہے' اس لحاظ سے فعل واحد مؤنث آنا چاہیے تھا لیکن ''يَاْتِيْنَ'' جمع مؤنث آیا ہے۔ یہ ایک استثنائی

صورت ہے۔ جیسے عام طور پر ''اَیَّامًا مَّعْدُوْدَۃً'' آتا ہے لیکن کبھی ''اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ'' بھی آ جاتا ہے۔ ''سَعْیًا'' حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔

ترجمہ:

وَاِذْ قَالَ :اور جب کہا	اِبْرٰھٖمُ :ابراہیمؑ نے
رَبِّ :اے میرے ربّ!	اَرِنِیْ :تو دکھا مجھ کو
کَیْفَ: کیسے	تُحْیِ :تو زندہ کرے گا
الْمَوْتٰی :مُردوں کو	قَالَ :(اللہ تعالیٰ نے) کہا
اَوَ :تو کیا	لَمْ تُؤْمِنْ:تو ایمان ہی نہیں لایا؟
قَالَ :(ابراہیمؑ نے) کہا	بَلٰی :کیوں نہیں
وَلٰکِنْ :اور لیکن	لِّیَطْمَئِنَّ :(میں پوچھتا ہوں) تاکہ پرسکون ہو جائے
قَلْبِیْ :میرا دل	قَالَ :(اللہ تعالیٰ نے) کہا
فَخُذْ :پس تو پکڑ	اَرْبَعَۃً :چار
مِّنَ الطَّیْرِ :پرندوں میں سے	فَصُرْ :پھر تو مائل کر
ھُنَّ :ان کو	اِلَیْکَ :اپنی طرف
ثُمَّ :پھر	اجْعَلْ :تو رکھ
عَلٰی کُلِّ جَبَلٍ :ہر ایک پہاڑ پر	مِّنْھُنَّ :ان میں سے
جُزْءًا :ایک ٹکڑا	ثُمَّ :پھر
ادْعُھُنَّ :تو پکار اُن کو	یَاْتِیْنَکَ :وہ آئیں گے تیرے پاس
سَعْیًا :دوڑتے ہوئے	وَاعْلَمْ :اور تو جان لے
اَنَّ اللّٰہَ :کہ اللہ	عَزِیْزٌ :بالادست ہے
حَکِیْمٌ :حکمت والا ہے	

نوٹ (۱) : اس سے پہلے رباعی مجرد کے چند الفاظ آ چکے ہیں اور اب رباعی مزید فیہ کا لفظ پہلی مرتبہ آیا ہے۔ اس مقام پر اس کے متعلق چند باتیں ذہن نشین کر لیں۔

(ا) رباعی کے اَوزان میں ''فَا'' اور ''عین'' کے بعد ''لام'' دو مرتبہ آتا ہے۔ نوٹ کر

لیں کہ پہلا ''لام'' مادے کے تیسرے حرف کے لیے اور دوسرا ''لام'' چوتھے حرف کے لیے ہوتا ہے۔

(۲) رباعی مجرد کا ایک ہی باب ہے۔ اس کا ماضی اور مضارع فَعْلَلَ اور يُفَعْلِلُ کے وزن پر آتے ہیں' جبکہ مصدر کے لیے زیادہ تر فَعْلَلَةً اور فِعْلَالًا کے اوزان استعمال ہوتے ہیں۔ جیسے طَمْئَنَ ۔ يُطَمْئِنُ ۔ طَمْئَنَةً اور زَلْزَلَ۔ يُزَلْزِلُ ۔ زِلْزَالًا وغیرہ۔ یہ باب زیادہ تر متعدی ہوتا ہے۔

(۳) رباعی مزید فیہ کے تین ابواب ہیں جس میں سے ایک آیت زیرِ مطالعہ میں آیا ہے۔ اس کے ماضی' مضارع اور مصدر کے اوزان یہ ہیں: اِفْعَلَلَّ ۔ يَفْعَلِلُّ ۔ اِفْعِلَّالًا۔ آپ کی آسانی کے لیے ہم نے مصدر کے وزن کو کھول کر اِفْعِلْ لَالٌ لکھا ہے تاکہ تیسرے اور چوتھے کلمہ پر آپ صحیح حرکات وسکنات لگا سکیں۔ نوٹ کر لیں کہ اس باب کا ہمزہ' ہمزۃ الوصل ہے اور یہ باب زیادہ تر لازم ہوتا ہے۔

نوٹ (۲) : اس آیت کے حوالے سے ایک اہم اور بنیادی بات یہ نوٹ کر لیں کہ یہ کائنات اور اس کی ہر چیز اپنی زبانِ حال سے اللہ تعالیٰ کے وجود' اس کی توحید اور اس کی قدرت کی گواہی دے رہی ہے۔ اور یہی ایمان کی اصل بنیاد ہے۔ اس ایمان کے بعد جو تفصیلات اور جزئیات قرآن اور حدیث سے ثابت ہیں ان پر ایمان اور عمل لازمی ہو جاتا ہے' خواہ اطمینانِ قلب حاصل ہو یا نہ ہو۔

نوٹ کریں کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایمان کا اقرار کیا ہے تب اللہ تعالیٰ نے ان کے اطمینانِ قلب کا بندوبست کیا ہے۔ اسی طرح سے جو لوگ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام پر ایمان اور اخلاصِ نیت سے عمل کرتے رہتے ہیں اللہ تعالیٰ اپنی قدرت سے انہیں اطمینانِ قلب عطا فرماتا ہے۔

آیت ۲۶۱

﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ۭ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝﴾

س ب ع

سَبَعَ (ف) سَبْعًا : ساتواں حصہ لینا (کسی چیز کو سات حصوں میں تقسیم کر کے)۔

سَبْعٌ (اسم عدد بھی ہے) : سات۔ ﴿لَهَا سَبْعَةُ اَبْوَابٍ ط﴾ (الحجر:٤٤) ''اس کے سات دروازے ہیں۔''

سَبْعُوْنَ : ستر۔ ﴿اِنْ تَسْتَغْفِرْلَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ط﴾ (التوبة:٨٠) ''اگر آپؐ استغفار کریں ان کے لیے ستر مرتبہ تو (بھی) ہرگز نہیں بخشے گا اللہ ان کو۔''

سَبُعٌ (اسم ذات) : درندہ (کیونکہ وہ اپنے شکار کو پھاڑ کر ٹکڑوں میں تقسیم کرتا ہے)۔ ﴿وَمَا اَكَلَ السَّبُعُ﴾ (المائدۃ:٣) ''اور جس کو کھایا درندے نے۔''

س ن ب ل

سَنْبَلَ (رُباعی) سَنْبَلَةً : کھیتی کا بالیاں نکالنا۔

سُنْبُلٌ ج سَنَابِلُ (اسم ذات) : پودے کی بال' خوشہ۔ ﴿فَمَا حَصَدْتُّمْ فَذَرُوْهُ فِیْ سُنْبُلِهٖ﴾ (یوسف:٤٧) ''پس جو تم لوگ کاٹو تو چھوڑ دو اُس کو اس کے خوشے میں۔'' ﴿وَسَبْعَ سُنْبُلٰتٍ خُضْرٍ﴾ (یوسف:٤٣) ''اور سات سبز بالیاں (خوشے)۔''

ترکیب : ''كَمَثَلِ'' کا مضاف الیہ ہونے کی وجہ سے ''حَبَّةٍ'' مجرور ہے۔ ''اَنْۢبَتَتْ'' کا فاعل اس میں ''هِیَ'' کی ضمیر ہے جو ''حَبَّةٍ'' کے لیے ہے' جبکہ مرکب اضافی ''سَبْعَ سَنَابِلَ'' اس کا مفعول ہے۔ اس لیے اس کا مضاف ''سَبْعَ'' منصوب ہے اور مضاف الیہ ''سَنَابِلَ'' حکماً مجرور ہے۔ ''مِائَةُ حَبَّةٍ'' مبتدأ مؤخر ہے اس لیے مضاف ''مِائَةُ'' مرفوع ہے' اس کی خبر محذوف ہے اور ''فِیْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ'' قائم مقام خبر مقدم ہے۔ ''يُضٰعِفُ'' کا مفعول محذوف ہے جو کہ ''اِنْفَاقًا'' ہو سکتا ہے' جبکہ ''لِمَنْ'' متعلق فعل ہے۔

ترجمہ:

مَثَلُ الَّذِيْنَ : ان لوگوں کی مثال جو — يُنْفِقُوْنَ : خرچ کرتے ہیں

اَمْوَالَهُمْ : اپنے مالوں کو — فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ : اللہ کی راہ میں

كَمَثَلِ حَبَّةٍ : ایک ایسے دانے کی مثال کی طرح ہے — اَنْۢبَتَتْ : جس نے اگائے

سَبْعَ سَنَابِلَ : سات خوشے — فِیْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ : ہر ایک خوشے میں

مِّائَةُ حَبَّةٍ : ایک سو دانے ہیں　　　وَاللّٰهُ : اور اللہ
يُضٰعِفُ : ضرب دیتا ہے (انفاق کو)　　　لِمَنْ : اس کے لیے جس کے لیے
يَّشَآءُ : وہ چاہتا ہے　　　وَاللّٰهُ : اور اللہ
وَاسِعٌ : وسعت دینے والا ہے　　　عَلِيْمٌ : جاننے والا ہے

نوٹ (۱): لفظ ''مِائَةٌ'' میں الف زائدہ ہے جیسے ''اُولٰٓئِكَ'' میں واوٴ زائدہ ہے۔ چند الفاظ میں حروفِ زائدہ لکھنے کی وجہ سمجھ لیں۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانے میں بھی اور آج بھی عربی حرکات وسکنات کے بغیر لکھی اور پڑھی جاتی ہے' جیسے فارسی اور اردو حرکات وسکنات کے بغیر لکھی اور پڑھی جاتی ہے۔ البتہ غیر عربی لوگوں کی سہولت کے لیے بعد میں قرآن مجید میں حرکات وسکنات لکھنے کا رواج ہوا۔

اسی طرح عربی حروف پر نقطے ڈالنے کا رواج بھی بعد میں ہوا۔ صحابہ کرامؓ کے زمانے میں عربی حروف کے نقطوں کے بغیر لکھی اور پڑھی جاتی تھی۔ مثلاً اس زمانے میں حرف ''ح'' کو حسبِ موقع ج' ح اور خ پڑھا جاتا تھا اور بالکل درست پڑھا جاتا تھا۔ ہم لوگ اس کو ناممکن قرار دینے سے پہلے اتنا بھی نہیں سوچتے کہ انگریزی اگرچہ ہماری مادری زبان نہیں ہے' لیکن اس کے باوجود ہم لوگ انگریزی حرف ''C'' کو لفظ circle میں پہلے سین کی آواز سے اور پھر کاف کی آوز سے پڑھ لیتے ہیں۔ حرف ''G'' کو لفظ general میں جیم اور God میں گاف کی آواز سے پڑھ لیتے ہیں۔ علیٰ ھذا القیاس۔

بہرحال عربی حروف پر نقطے نہ ہونے کی وجہ سے کچھ الفاظ میں مشابہت دُور کرنے کے لیے کسی ایک لفظ میں کوئی زائد حرف لکھا جاتا تھا۔ جیسے ''اليك'' سے فرق کرنے کے لیے ''اولٓئك'' میں واوٴ زائد لکھا گیا۔ اسی طرح ''منه'' سے فرق کرنے کے لیے ''مائة'' میں الف زائد لکھا گیا۔

نوٹ (۲) : ''كُلٌّ'' کا مضاف الیہ زیادہ تر واحد نکرہ آتا ہے۔ لیکن اگر معرفہ آئے تو مفہوم میں کچھ فرق پڑتا ہے۔ مثلاً ''كُلُّ كِتَابٍ'' کا مطلب ہے ہر ایک کتاب۔ جبکہ ''كُلُّ الْكِتَابِ'' کا مطلب ہے کل کی کل کتاب' یعنی وہ پوری کتاب جس کی بات ہو رہی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حقیقی محبت کے تقاضے

مدرس : پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ اَبِیْ قُرَادٍ ؓ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ تَوَضَّاَ یَوْمًا فَجَعَلَ اَصْحَابُہٗ یَتَمَسَّحُوْنَ بِوَضُوْئِہٖ فَقَالَ لَھُمُ النَّبِیُّ ﷺ: ((مَا یَحْمِلُکُمْ عَلٰی ھٰذَا؟)) قَالُوْا: حُبُّ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ فَقَالَ النَّبِیُّ ﷺ: ((مَنْ سَرَّہٗ اَنْ یُّحِبَّ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ اَوْ یُحِبَّہُ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ فَلْیَصْدُقْ حَدِیْثَہٗ اِذَا حَدَّثَ وَلْیُؤَدِّ اَمَانَتَہٗ اِذَا ائْتُمِنَ وَلْیُحْسِنْ جِوَارَ مَنْ جَاوَرَہٗ)) (رواہ البیھقی فی شعب الایمان)

''حضرت عبدالرحمٰن بن ابی قراد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن وضو فرمایا تو آپؐ کے صحابہ رضی اللہ عنہم وضو کا پانی لے لے کر (اپنے چہروں اور جسموں پر) ملنے لگے' آپؐ نے فرمایا: ''تم کو کیا چیز اس فعل پر آمادہ کرتی ہے اور کون سا جذبہ تم سے یہ کام کراتا ہے؟'' انہوں نے عرض کیا: ''اللہ اور اس کے رسولؐ کی محبت''۔ ان کا یہ جواب سن کر آپؐ نے فرمایا: ''جس شخص کو یہ بات پسند ہو کہ اس کو اللہ اور اس کے رسولؐ سے حقیقی محبت ہو یا یہ کہ اللہ اور اس کے رسولؐ اس سے محبت کریں تو اسے چاہیے کہ جب وہ بات کرے تو ہمیشہ سچ بولے' اور جب کوئی امانت اس کے سپرد کی جائے تو ادنیٰ خیانت کے بغیر اس کو ادا کرے اور جس کے پڑوس میں اس کا رہنا ہو اُس کے ساتھ بہتر سلوک کرے''۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وضو فرما رہے تھے' صحابہؓ آپؐ کے وضو کے پانی کو ہاتھوں میں لے کر اپنے جسموں پر مل رہے تھے۔ آپؐ نے اُن سے دریافت فرمایا کہ وہ یہ کام کیوں کر رہے ہیں؟ جواب میں انہوں نے عرض کیا کہ ہم یہ کام اللہ کی محبت اور اس کے رسولؐ کی محبت میں کر رہے ہیں۔ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں وہ تین عمل بتائے جو اللہ اور اس کے رسولؐ کی محبت کا باعث

ہیں۔غور کرنے کا مقام ہے کہ آپ ﷺ نے اُن کے اس عمل پر نہ تو پسندیدگی کا اظہار کیا اور نہ ہی ناراض ہوئے۔ پسندیدگی کا اظہار تو اس لیے نہیں کیا کہ عقیدت پر اکتفا عمل میں کوتاہی کا باعث بنتا ہے اور سہل پسند نفس اس بات کو کافی سمجھتا ہے کہ اُس کا تعلق کسی خدارسیدہ بزرگ کے ساتھ ہے اور یہ بات اُس کو دوسرے ضروری اعمال کے بجالانے میں سست کر دیتی ہے جو کہ اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے۔اسلام تو عمل پر زور دیتا ہے۔رسول اللہ ﷺ اُمت کو یہ بات سکھانا چاہتے تھے کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے ساتھ محبت کا تقاضا یہ ہے کہ اسلامی اخلاق و اقدار کو اپنایا جائے۔ عقیدت کے اظہار کا یہی بہترین طریقہ ہے۔یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ اس بات کو پسند نہ کرتے تھے کہ آپؐ کسی محفل میں جائیں تو اہل محفل کھڑے ہو کر عقیدت کا اظہار کریں۔اسی طرح اس موقع پر بھی آپؐ نے پسندیدگی کا اظہار نہیں کیا کہ اُن کے وضو کے پانی کو دوسرے لوگ عقیدۃً استعمال کریں۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کے اس عمل پر ناپسندیدگی کا اظہار رسول اللہ ﷺ نے اس لیے نہیں کیا کہ آپؐ کے وضو کا مستعمل پانی پاک تھا اور اس سے فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا۔عام لوگوں کے وضو کا مستعمل پانی پاک نہیں رہتا' کیونکہ وضو کے پانی کے ساتھ جہاں اعضاء کی گرد و غبار یا میل کچیل شامل ہو جاتی ہے وہاں ہاتھ' پاؤں' آنکھوں اور کانوں وغیرہ کے صغیرہ گناہ بھی پانی میں مل کر اسے آلودہ اور ناقابل استعمال بنا دیتے ہیں۔مگر رسول اللہ ﷺ کے اعضاء تو نورانیت سے بھرپور تھے۔آپؐ کے استعمال شدہ پانی کے آلودہ ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا' لہٰذا آپؐ نے صحابہ کو اپنے وضو کے مستعمل پانی کو استعمال کرنے سے روکا نہیں' البتہ انہیں تین بہت ضروری اعمال کی ترغیب دی۔پہلی بات یہ کہ ہمیشہ سچ بولیں' کیونکہ جھوٹ کبیرہ گناہ ہے جو کئی دوسرے گناہوں کا سبب بنتا ہے۔یہ بہت بڑی اخلاقی کمزوری ہے۔جھوٹ کی عادت انسان کے عزت و وقار کو ختم کر دیتی ہے۔جھوٹ بول کر روزی کمانے سے رزق میں حرام شامل ہو جاتا ہے اور حرام روزی عبادت اور دُعا کی قبولیت میں رکاوٹ بن جاتی ہے۔جھوٹ کو آپؐ نے منافقت کی علامتوں میں سے ایک علامت بتایا ہے۔حضرت ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((يُطْبَعُ الْمُؤْمِنُ عَلَى الْخِلَالِ كُلِّهَا اِلَّا الْخِيَانَةَ وَالْكَذِبَ))(۱)

''مؤمن کی طبیعت اور فطرت میں ہر خصلت کی گنجائش ہے سوائے خیانت اور

(۱) مسند احمد۔

جھوٹ کے''۔

ایک متفقٌ علیہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جھوٹ سے دُور رہو' بے شک جھوٹ بولنے کی عادت آدمی کو سرکشی و نافرمانی کے راستے پر ڈال دیتی ہے اور سرکشی دوزخ تک پہنچا دیتی ہے''۔ پس آپؐ نے اس موقع پر بھی اپنے عقیدت مندوں کو ہمیشہ سچ بولنے کی تلقین فرمائی۔

دوسری بات رسول اللہ ﷺ نے یہ ارشاد فرمائی کہ جب تمہارے پاس امانت رکھی جائے تو وہ پوری کی پوری واپس لوٹاؤ۔ گویا آپؐ نے خیانت کے ارتکاب سے روکا اور امانت داری اپنانے کی تلقین کی۔ خیانت بہت بڑی اخلاقی برائی ہے۔ آپ ﷺ نے منافقت کی علامتوں میں سے ایک علامت خیانت کو قرار دیا ہے۔ امانت داری کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ ہر معاہدہ امانت ہے اور اس کی پابندی نہ کرنا خیانت ہے۔ اپنے فرائض منصبی میں کوتاہی کا ارتکاب بھی خیانت ہے۔ کسی حق دار کو اُس کے حق سے محروم کرنا خیانت ہے۔ ایک آدمی کسی دوسرے کے ساتھ راز داری کی بات کرتا ہے تو اس بات کا ذکر دوسروں کے سامنے کرنا خیانت ہے۔ الغرض کسی بھی ذمہ داری کے پورا کرنے میں کوتاہی کرنا امانت میں خیانت کرنا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے مستعمل پانی کو جسم پر لینے والے صحابہ کرام ؓ کو تیسری بات آپؐ نے یہ ارشاد فرمائی کہ اپنے ہمسائے کے ساتھ اچھا رویہ رکھیں۔ ہمسائے کے ساتھ حسن سلوک کے متعلق حضرت عائشہ ؓ سے مروی آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

((مَا زَالَ جِبْرِيْلُ يُوْصِيْنِيْ بِالْجَارِ حَتّٰى ظَنَنْتُ اَنَّهٗ سَيُوَرِّثُهٗ)) (۲)

''جبریل ؑ پڑوسی کے حق کے بارے میں مجھے برابر تاکید کرتے رہے' یہاں تک کہ میں خیال کرنے لگا کہ وہ اس کو وارث قرار دے دیں گے''۔

ایک موقع پر تو رسول اللہ ﷺ نے تین دفعہ اللہ کی قسم کھا کر فرمایا:

((لَا وَاللّٰهِ لَا يُؤْمِنُ ' لَا وَاللّٰهِ لَا يُؤْمِنُ ' لَا وَاللّٰهِ لَا يُؤْمِنُ)) قَالُوْا : وَمَنْ ذَاكَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ؟ قَالَ :((جَارٌ لَا يَأْمَنُ جَارُهٗ بَوَائِقَهٗ))(۳)

---

(۲) صحیح البخاری' کتاب الادب' باب الوصاۃ بالجار۔وصحیح مسلم' کتاب البر والصلة والآداب' باب الوصية بالجار والاحسان اليه۔

(۳) مسند احمد۔

''اللہ کی قسم وہ شخص صاحبِ ایمان نہیں' اللہ کی قسم وہ شخص صاحبِ ایمان نہیں' اللہ کی قسم وہ شخص صاحبِ ایمان نہیں!'' صحابہ نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ کون؟ آپؐ نے فرمایا:''جس کا پڑوسی اس کی شرارتوں سے محفوظ و مامون نہ ہو''۔

ہمسایہ ہر وقت کا ساتھی ہوتا ہے' اگر اس کی طرف سے برا سلوک ہو رہا ہو تو زندگی اجیرن ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس اگر ہمسائے آپس میں حسنِ سلوک کے ساتھ رہ رہے ہوں تو دونوں کو چین اور سکون میسر ہوگا۔ وقت پڑنے پر ایک ہمسایہ دوسرے ہمسائے کا ہمدرد اور غمگسار ہوگا۔ حقوق ہمسایہ کے بارے میں ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَلْيُكْرِمْ جَارَهٗ)) (٤)

''جو شخص اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتا ہو اُس کے لیے لازم ہے کہ اپنے پڑوسی کے ساتھ اکرام کا معاملہ کرے''۔

ہمسائے کی تکلیف اور آرام کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے۔ ایک حدیث میں آپ ﷺ نے پڑوسی کے حقوق اس طرح بتائے ہیں:

((اِنْ مَرِضَ عُدْتَهٗ وَاِنْ مَاتَ شَيَّعْتَهٗ وَاِنِ اسْتَقْرَضَكَ اَقْرَضْتَهٗ وَاِنْ اَعْوَرَ سَتَرْتَهٗ وَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرٌ هَنَّاْتَهٗ وَاِنْ اَصَابَتْهُ مُصِيْبَةٌ عَزَّيْتَهٗ وَلَا تَرْفَعْ بِنَائَكَ فَوْقَ بِنَائِهٖ فَتَسُدَّ عَلَيْهِ الرِّيْحَ ' وَلَا تُؤْذِيْهِ بِرِيْحِ قِدْرِكَ اِلَّا اَنْ تَغْرِفَ لَهٗ مِنْهَا))(٥)

''اگر بیمار ہو جائے تو اس کی عیادت اور خبر گیری کرو۔ انتقال کر جائے تو اس کے جنازے کے ساتھ جاؤ۔ قرض مانگے تو قرض دو۔ اگر کوئی برا کام کر بیٹھے تو پردہ پوشی کرو۔ اگر اسے کوئی نعمت ملے تو اس کو مبارک باد دو۔ اگر اسے کوئی مصیبت پہنچے تو تعزیت کرو۔ اپنی عمارت اس کی عمارت سے اس طرح بلند نہ کرو کہ اس کے گھر کی ہوا بند ہو جائے۔ تمہاری ہانڈی کی مہک اس کے لیے باعثِ ایذا نہ ہو' اِلّا یہ کہ اس میں سے

(٤) صحیح البخاری' کتاب الادب' باب من کان یؤمن باللہ والیوم الاخر فلا یؤذ جارہ۔ وصحیح مسلم' کتاب الایمان' باب الحث علی اکرام الجار والضیف ولزوم الصمت الا عن الخیر۔

(٥) رواہ الطبرانی فی الکبیر۔

(باقی صفحہ 50 پر)

قرآن میں حذف اور اُس کی اقسام

حافظ محمد زبیر☆

یہ مضمون امام سیوطیؒ کی کتاب ''الاتقان'' اور امام زرکشیؒ کی کتاب ''البرھان'' سے ماخوذ ہے۔

لغت میں حذف کا معنیٰ 'گرا دینا' ہے جبکہ اس کی اصطلاحی تعریف امام زرکشیؒ نے ان الفاظ میں بیان کی ہے:

اسقاط جزء الکلام أو کله لدلیل

''کسی دلیل کی وجہ سے کلام کے ایک حصے یا کُل کلام کو ہی گرا دینا حذف کہلاتا ہے''۔

کلام میں اصلاً حذف نہیں ہوتا' اس لیے اگر کسی کلام میں حذف کے ہونے اور نہ ہونے' دونوں کا امکان برابر کی سطح پر موجود ہو تو پھر اس کلام میں حذف کو نہ ماننا بہتر ہے۔ اسی طرح اگر کسی کلام میں قلیل اور کثیر' دونوں طرح کے محذوفات ممکن ہوں تو اس صورت میں قلیل محذوفات پر کلام کو محمول کیا جائے گا۔

حذف کے دلائل

حذف نکالنے کے لیے ضروری ہے کہ کوئی نہ کوئی ایسی دلیل ہو جو اس بات کی طرف رہنمائی کرتی ہو کہ اس جگہ کلام میں کچھ محذوف ہے۔ بعض اوقات دلیل سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں پر محذوف 'مطلق' ہے اور بعض اوقات دلیل سے محذوفِ 'متعین' کی طرف اشارہ ہو رہا ہوتا ہے۔ کسی کلام میں محذوف کی موجودگی کو معلوم کرنے کے لیے کئی دلائل ہیں:

۱) عقل اس بات کی طرف رہنمائی کرے کہ یہاں کلام میں کچھ محذوف ہے' اور جب تک وہ محذوف نہ بیان کیا جائے اُس وقت تک اس کلام کا صحیح ہونا عقلاً محال ہو' مثلاً ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

☆ ریسرچ فیلو' شعبہ تحقیق اسلامی' قرآن اکیڈمی لاہور

﴿وَسْـَٔلِ الْقَرْيَةَ﴾ (یوسف:۸۲)

''اور آپ بستی (والوں) سے پوچھ لیں''۔

یہاں پر ہم کچھ نہ کچھ محذوف مانیں گے' کیونکہ کسی ''جگہ'' کا کلام کرنا عقلاً محال ہے سوائے اس کے کہ کوئی معجزہ ہو۔ اس لیے 'اَلْقَرْيَة' سے پہلے 'اَھل' محذوف نکالیں گے۔ اسی لیے ہم نے ترجمہ میں ''والوں'' کا اضافہ کیا ہے۔

۲) عادتِ شرعیہ سے یہ بات معلوم ہو کہ یہاں کچھ محذوف ہے' مثلاً ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ﴾ (النساء:۲۳)

''تمہارے اُوپر تمہاری ماؤں (سے نکاح) کو حرام کیا گیا ہے''۔

شریعت کا مقصود یہاں پر ذات کو حرام کرنا نہیں ہے' بلکہ اصل حرمت ایک مخصوص فعل کی ہے جو کہ اس ذات سے متعلق ہے' یعنی یہاں پر 'نکاح' کا لفظ محذوف ہے۔ بعض علماء نے یہ قاعدہ بھی بیان کیا ہے کہ حلت و حرمت کی نسبت اجسام کی طرف نہیں ہوتی بلکہ افعال کی طرف ہوتی ہے' یہاں پر بھی فعل 'نکاح' کو محذوف کر کے حرمت کی نسبت اس ذات کی طرف کر دی گئی جس سے وہ فعل متعلق تھا۔ چونکہ حلت و حرمت کا محل عقل دریافت نہیں کر سکتی اس لیے اس محذوف کا تعین عقل سے نہیں ہوا بلکہ بعض دوسرے دلائل شرعیہ سے معلوم ہوا کہ یہاں پر 'نکاح' کا فعل محذوف ہے' اسی لیے ہم نے ترجمے میں ''سے نکاح'' کا اضافہ کیا ہے۔

۳) بعض اوقات عرف و عادت اس بات کی دلیل ہوتے ہیں کہ یہاں کلام میں کچھ محذوف ہے۔ مثلاً ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا﴾ (آل عمران: ۱۶۷)

''اگر ہم لڑائی (کی جگہ) کو جانتے ہوتے''۔

اس آیت میں قتال سے مراد قتال بذاتِ خود نہیں بلکہ مکانِ قتال مراد ہے' کیونکہ اس زمانے کے عرف و عادت میں قتال کا علم نہ ہونا ایک بہت بڑا عیب تھا' اس لیے منافقین کا کہنا یہ نہیں تھا کہ ہم قتال کی حقیقت کو نہیں جانتے' بلکہ وہ مکانِ قتال کی بات کر رہے تھے۔ قتال سے مکانِ قتال مراد لینے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ منافقین کا غزوۂ اُحد کے موقع پر مسلمانوں سے اختلاف مکانِ قتال میں ہوا تھا۔

۴) خود کوئی لفظ اس بات کی دلیل ہو کہ یہاں پر کچھ محذوف ہے۔ مثلاً:

﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾

''(پڑھ) اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان' رحم کرنے والا ہے''۔

یہ مکمل آیت مبارکہ جار' مجرور بن رہی ہے اور جار' مجرور جملے میں کسی نہ کسی سے متعلق ہوتا ہے' لہٰذا یہاں پر فعل یا اسم محذوف مانیں گے۔ مثلاً اِقْرَاْ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔

۵) بعض اوقات لغت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں پر کچھ محذوف ہے۔ مثلاً:

ضَرَبْتَ ''تو نے مارا''۔

یہ فعل چونکہ متعدی ہے اس لیے مفعول کا ہونا ضروری ہے' پس فعل متعدی کے ساتھ مفعول کے عدم ذکر کی صورت میں مفعول کو محذوف مانا جائے گا۔

۶) بعض اوقات قرآن کے ایک دوسرے مقام سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یہاں پر کچھ محذوف ہے۔ مثلاً:

﴿لَمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا سَاعَةً مِّنْ نَّهَارٍ ۭ بَلٰغٌ﴾ (الاحقاف:۳۵)

''نہیں وہ رہے سوائے دن کی ایک گھڑی کے' (یہ) پہنچانا ہے''۔

اس آیت میں 'بَلٰغٌ' سے پہلے 'هٰذَا' محذوف ہے' جیسا کہ ایک دوسری آیت میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿هٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ﴾ (ابرٰهیم:۵۲)

حذف کی اقسام

امام زرکشیؒ نے اپنی کتاب 'البرھان' میں حذف کی آٹھ اقسام کا تذکرہ کیا ہے جو کہ درج ذیل ہیں:

پہلی قسم : پہلی قسم 'اقتطاع' ہے' یعنی کسی کلمہ کے ایک حرف کا ذکر کر کے باقی حروف کو حذف کر دینا۔ مثلاً:

﴿وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ﴾ (المائدۃ:٦)

''اور تم اپنے سروں (کے بعض حصے) کا مسح کرو''۔

اس آیت کے بارے میں بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ 'با' دراصل 'بَعْض' کا ایک حرف ہے اور بعض کے باقی حروف کو حذف کر دیا گیا ہے' لہٰذا 'با' سے مراد 'بَعْض' ہے' یعنی اپنے سر کے

بعض حصے کا مسح کرو۔

دوسری قسم : دوسری قسم 'اکتفاء' ہے۔ اس کا معنی ہے کہ کوئی مقام ایسی دو چیزوں کے ذکر کا تقاضا کرتا ہو جن میں تلازم اور ارتباط ہو' لیکن ان دونوں چیزوں کے ذکر کرنے کی بجائے ان میں سے ایک کے ذکر پر اکتفاء کیا جائے۔ مثلاً:

﴿بِيَدِكَ الْخَيْرُ ط﴾ (آل عمران:٢٦)

''تیرے ہی ہاتھ میں تمام بھلائیں (اور برائیاں) ہیں''۔

حالانکہ خیر کے ساتھ ساتھ شر بھی اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے' اس لیے تقدیر عبارت یوں ہوگی: 'بِيَدِكَ الْخَيْرُ وَالشَّرُّ'۔ صرف خیر کا ذکر کرنے میں حکمت یہ ہے کہ یہ بندوں کو زیادہ مرغوب و مطلوب ہے۔ اسی طرح ﴿وَلَهٗ مَا سَكَنَ فِي الَّيْلِ وَالنَّهَارِ ط﴾ (الانعام:١٣) سے مراد 'ما سكن و ما تحرك' ہے' اور صرف ''سکون'' کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کیونکہ سکون اصل ہے اور حرکت کبھی کبھی ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں مخلوقات کی ایک بہت بڑی تعداد اکثر و بیشتر سکون کی حالت میں رہتی ہے' مثلاً جمادات وحیوانات وغیرہ۔ اسی طرح ﴿الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ﴾ (البقرة:٣) میں 'بِالْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ' مراد ہے' کیونکہ دونوں پر ایمان لانے کے بعد ایمان مکمل ہوتا ہے اور یہاں پر صرف غیب کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ دونوں میں سے غیب پر ایمان زیادہ ممدوح ہے۔ اسی طرح ﴿وَمَا بَيْنَهُمَا وَرَبُّ الْمَشَارِقِ ۝﴾ (الصّٰفّٰت) سے مراد 'الْمَشَارِقِ وَالْمَغَارِبِ' ہے اور صرف مشرق کا تذکرہ اس لیے کیا گیا ہے کہ دونوں سمتوں میں زیادہ مشہور مشرق ہے۔ اسی طرح ﴿لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ط﴾ (البقرة:٢٧٣) سے مراد 'اِلْحَافًا وَغَيْرَ اِلْحَافٍ' ہے۔ اسی طرح ﴿مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ﴾ (آل عمران:١١٣) سے مراد 'اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ وَّاُخْرٰى غَيْرُ قَآئِمَةٍ' ہے۔ اسی طرح ﴿وَلِتَسْتَبِيْنَ سَبِيْلُ الْمُجْرِمِيْنَ ۝﴾ (الانعام) سے مراد 'الْمُجْرِمِيْنَ وَالْمُسْلِمِيْنَ' ہے۔ ابن الانباری نے ﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝﴾ (البقرة) سے مراد 'لِلْمُتَّقِيْنَ وَالْكَافِرِيْنَ' کہا ہے۔ اسی طرح ﴿لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ قف﴾ (البقرة:٢٨٥) سے مراد 'بَيْنَ اَحَدٍ وَّاَحَدٍ' ہے۔ اسی طرح ﴿ لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ ط﴾ (الحديد:١٠) کے بعد 'وَمَنْ اَنْفَقَ بَعْدَهٗ وَقَاتَلَ' محذوف ہے۔ اسی طرح قول باری تعالیٰ ﴿وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا ۝﴾ (النساء) میں 'فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ

جَمِیْعًا' سے پہلے 'وَمَنْ لَّا یَسْتَنْکِفُ وَلَا یَسْتَکْبِرُ' محذوف ہے' کیونکہ اگلی آیات میں دونوں گروہوں کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔اسی طرح ﴿اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ لَیْسَ لَهٗ وَلَدٌ﴾ (النساء:١٧٦) کے بعد 'وَلَا وَالِدٌ' محذوف ہے' کیونکہ اس کے بعد بہن کا حصہ نصف بتایا گیا' اور اگر باپ موجود ہو تو وہ بہن کے حصے کو ساقط کر دیتا ہے۔

تیسری قسم : تیسری قسم 'احتباک' کہلاتی ہے۔اس کا معنی یہ ہے کہ کلام میں دو متقابل اکٹھے ہوں اور ان دونوں میں سے ہر ایک کا مقابل حذف کر دیا جائے۔مثلاً:

﴿وَمَثَلُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِیْ یَنْعِقُ﴾ (البقرة:١٧١)

''اور مثال (انبیاء اور) ان لوگوں کی جنہوں نے کفر کیا اُس شخص کی ہے جو پکارتا ہے (اور جس کو پکارا جاتا ہے)''۔

اس آیت مبارکہ کی تقدیر عبارت 'وَمَثَلُ الْاَنْبِیَاءِ وَالْكُفَّارِ كَمَثَلِ الَّذِیْ یَنْعِقُ وَالَّذِیْ یُنْعَقُ بِهٖ' ہے۔اوّل کلام میں 'اَلْاَنْبِیَاءُ' کو محذوف کر دیا گیا' کیونکہ اس پر کلام کے دوسرے حصے کے الفاظ 'اَلَّذِیْ یَنْعِقُ' دلالت کر رہے ہیں' جبکہ کلام کے دوسرے حصے سے 'اَلَّذِیْ یُنْعَقُ بِهٖ' کو حذف کر دیا گیا' کیونکہ کلام کے پہلے حصے کے الفاظ 'اَلَّذِیْنَ كَفَرُوْا' اس پر دلالت کر رہے ہیں۔اسی طرح ﴿فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَاُخْرٰی كَافِرَةٌ﴾ (آل عمران:١٣) بھی اسی کی مثال ہے جس کی تقدیر عبارت 'فِئَةٌ مُؤْمِنَةٌ تُقَاتِلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَاُخْرٰی كَافِرَةٌ تُقَاتِلُ فِیْ سَبِیْلِ الطَّاغُوْتِ' ہے ۔اسی طرح ﴿خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَیِّئًا﴾ (التوبة:١٠٢) بھی اسی کی مثال ہے جس کی تقدیر عبارت 'خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا بِسَیِّئٍ وَاٰخَرَ سَیِّئًا بِصَالِحٍ' ہے۔

چوتھی قسم : چوتھی قسم یہ ہے کہ کوئی تمثیل بیان کرتے وقت بعد میں آنے والے کلام کے ایک جزء کو حذف کر دیا جائے۔مثلاً اگر کوئی فقیہہ یہ کہتا ہے:

اَلنَّبِیْذُ مُسْكِرٌ فَهُوَ حَرَامٌ

''نبیذ نشہ آور ہے (اور ہر نشہ آور حرام ہے) اس لیے وہ حرام ہے''۔

تو اس عبارت میں 'اَلنَّبِیْذُ مُسْكِرٌ' کے بعد 'وَكُلُّ مُسْكِرٍ حَرَامٌ' محذوف ہے۔

پانچویں قسم : پانچویں قسم یہ ہے کہ کسی فعل سے دو چیزوں پر استدلال کیا جائے جبکہ حقیقت میں صرف ایک ہی چیز پر استدلال ممکن ہو' تو ایسی جگہ ایک اور فعل کو محذوف نکالیں

گے۔مثلاً:

﴿وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ﴾ (الحشر:۹)

''اور جن لوگوں نے (ہجرت والے) گھر کو ٹھکانا بنایا اور (پختہ کیا) ایمان کو''۔

اس آیت مبارکہ میں 'الْاِيْمَانَ' سے پہلے 'اِعْتَقَدُوْا' کو محذوف مانیں گے۔اسی طرح بعض علماء نے ﴿لَهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ﴾(الحج:۴۰) کو بھی اسی نوع میں شمار کیا ہے اور 'صَلَوٰتٌ' سے پہلے 'لَتُرِكَتْ' محذوف نکالا ہے' کیونکہ نمازیں گرائی نہیں جاتیں۔اسی طرح ﴿لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ﴾(البقرۃ:۲۳۳) میں 'مَوْلُوْدٌ' سے پہلے 'يُضَارَّ' محذوف ہوگا۔اسی طرح ﴿فَاَجْمِعُوْا اَمْرَكُمْ وَشُرَكَآءَكُمْ﴾ (یونس:۷۱) میں 'شُرَكَآءَكُمْ' سے پہلے 'وَادْعُوْا' محذوف ہے۔

چھٹی قسم : چھٹی قسم یہ ہے کہ کلام دو چیزوں کا متقاضی ہو جبکہ بیان صرف ایک چیز ہو۔مثلاً:

﴿فَمَنْ رَّبُّكُمَا يٰمُوْسٰى﴾ (طٰہٰ)

''پس تم دونوں کا ربّ کون ہے اے موسیٰؑ (اور ہارونؑ)؟''

اس آیت مبارکہ میں 'مُوْسٰى' کے بعد 'هَارُوْنَ' محذوف ہے۔

ساتویں قسم : ساتویں قسم یہ ہے کہ دو چیزوں کا ذکر کیا جائے جبکہ ان کے بعد آنے والی ضمیر صرف ایک ہی چیز کی طرف لوٹائی جائے۔مثلاً:

﴿وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَاۨ انْفَضُّوْا اِلَيْهَا﴾ (الجُمعۃ:۱۱)

''اور جب وہ تجارت یا کھیل تماشے کو دیکھتے ہیں تو اس کی طرف دوڑے جاتے ہیں''۔

اس آیت مبارکہ میں 'تِجَارَةً' اور 'لَهْوًا' کا ذکر کرنے کے بعد 'اِلَيْهَا' میں صرف ایک ضمیر لوٹائی گئی ہے۔اس آیت میں ضمیر بعید کی طرف لوٹائی گئی ہے' کیونکہ تجارت اصل ہے' جبکہ لَهْوٌ اس کی ایک قسم ہے۔علامہ زمخشری نے اس آیت کی تقدیر عبارت یوں بیان کی ہے: 'وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً انْفَضُّوْا اِلَيْهَا اَوْ لَهْوًا انْفَضُّوْا اِلَيْهَا'۔اسی طرح ﴿وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾(التوبۃ:۳۴) میں بھی 'هَا' کی ضمیر صرف چاندی کی طرف لوٹائی گئی ہے' کیونکہ چاندی کا ذکر قریب ہے۔اسی طرح ﴿وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۭ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ﴾(البقرۃ:۴۵) اور ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ

﴿وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ﴾ (الانفال:۲۰) اور ﴿وَمَنْ يَّكْسِبْ خَطِيْٓئَةً اَوْ اِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ بِهٖ بَرِيْٓئًا﴾ (النساء:۱۱۲) بھی اسی نوع کی مثالیں ہیں۔

آٹھویں قسم : آٹھویں قسم 'اختزال' ہے۔ یہ باب افتعال سے ہے' جس کا لغوی معنی 'درمیان کو کاٹنا' ہے' جبکہ بعد میں یہ لفظ اصطلاحاً ایک یا ایک سے زائد کلمات (اسم' فعل یا حرف) کے حذف پر بولا جانے لگا۔ اس کی کئی اقسام ہیں:

(i) مبتدأ کا حذف: اس کی مثال درج ذیل آیت ہے:

﴿سَيَقُوْلُوْنَ ثَلٰثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ ۚ﴾ (الکہف:۲۲)

''وہ عنقریب کہیں گے (وہ) تین تھے اور اُن کا چوتھا اُن کا کتا تھا''۔

اس آیت میں 'ثَلَاثَةٌ' خبر ہے جس کا مبتدأ 'هُمْ' محذوف ہے۔ تقدیر عبارت 'هُمْ ثَلَاثَةٌ' ہے۔ اسی طرح ﴿بَلٰغٌ ۚ فَهَلْ يُهْلَكُ﴾ (الاحقاف:۳۵) کے شروع میں مبتدأ 'هٰذَا' محذوف ہے۔ اور ﴿بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ﴾ (الانبیاء) میں 'عِبَادٌ' خبر ہے جس سے پہلے 'مبتدأ 'هُمْ' محذوف ہے۔ اسی طرح ﴿بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكُمْ ۭ اَلنَّارُ ۭ﴾ (الحج:۷۲) 'میں 'النار' خبر ہے جس سے پہلے مبتدأ 'هِيَ' محذوف ہے۔ اسی طرح ﴿سُوْرَةٌ اَنْزَلْنٰهَا﴾ (النور:۱) کے شروع میں مبتدأ 'هٰذِهٖ' محذوف ہے اور ﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ اَسَاۗءَ فَعَلَيْهَا ۭ﴾ (فُصّلت:۴۶) میں 'فَلِنَفْسِهٖ' اور 'فَعَلَيْهَا' دونوں خبر ہیں جن کا مبتدأ محذوف ہے اور تقدیر عبارت 'مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَعَمَلُهٗ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ اَسَاۗءَ فَاَسَاۗئَتُهٗ عَلَيْهَا' ہوگی۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ ﴿وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ ۭ﴾ (النساء:۱۷۱) میں 'ثَلٰثَةٌ' خبر سے پہلے 'اٰلِهَتُنَا' مبتدأ محذوف ہے جبکہ ابن جنیؒ نے کہا ہے کہ یہاں مضاف محذوف ہے اور تقدیر عبارت یوں ہے: 'وَلَا تَقُوْلُوْا ثَالِثُ ثَلَاثَةٍ' جیسا کہ ایک اور آیت میں ہے۔

(ii) خبر کا حذف: اس کی مثال درج ذیل آیت ہے:

﴿اُكُلُهَا دَاۗىِٕمٌ وَّظِلُّهَا ۭ﴾ (الرعد:۳۵)

''اس کا پھل ہمیشہ رہنے والا ہے اور اس کا سایہ (ہمیشہ رہنے والا ہے)''۔

اس آیت میں 'ظِلُّهَا' مبتدأ ہے اور اس کے بعد 'دَاۗىِٕمٌ' خبر محذوف ہے۔ اسی طرح آیت مبارکہ ﴿قَالُوْا لَا ضَيْرَ﴾ (الشُّعراء:۵۰) میں لائے نفی جنس کی خبر محذوف ہے۔ علامہ زمخشری نے اس کی تقدیر عبارت یوں بیان کی ہے 'قَالُوْا لَا ضَيْرَ عَلَيْنَا فِيْ قَتْلِكَ'۔ آیت

مبارکہ ﴿وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْا﴾ (المائدۃ:۳۸) کے بارے میں 'سیبویہ' نے کہا ہے کہ اس کی خبر محذوف ہے اور تقدیر عبارت 'فِیْمَا اَتْلُوْہُ السَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ' ہے۔ اسی طرح ﴿اَلزَّانِیَةُ وَالزَّانِیْ﴾ (النور:۲) سے پہلے بھی خبر 'فِیْمَا نَقُصُّ عَلَیْکُمْ' محذوف ہے۔ آیت مبارکہ ﴿لَوْ لَا اَنْتُمْ لَکُنَّا مُؤْمِنِیْنَ﴾ (سبا) میں بھی 'اَنْتُمْ' مبتدأ کے بعد خبر محذوف ہے۔

(iii) مبتدأ یا خبر دونوں میں سے کسی ایک کے محذوف ہونے کا احتمال ہو: اس کی مثال درج ذیل آیت ہے:

﴿فَصَبْرٌ جَمِیْلٌ﴾ (یوسف:۱۸)

''پس (میرا معاملہ) صبر جمیل ہے''۔

اس آیت میں اگر ہم ﴿صَبْرٌ جَمِیْلٌ﴾ کو مبتدأ مانیں تو اس کی خبر 'اَجْمَلُ' محذوف ہو سکتی ہے اور اگر ہم ﴿صَبْرٌ جَمِیْلٌ﴾ کو خبر مانیں تو اس کا مبتدأ 'أمری' محذوف ہو سکتا ہے۔ اسی طرح ﴿طَاعَةٌ مَّعْرُوْفَةٌ﴾ (النور:۵۳) بھی اسی نوع کی مثال ہے جس کی تقدیر عبارت 'طَاعَةٌ مَّعْرُوْفَةٌ اَوْلٰی لَکُمْ مِنْ ھٰذَا' یا 'اَمْرُکُمُ الَّذِیْ یُطْلَبُ مِنْکُمْ طَاعَةٌ مَّعْرُوْفَةٌ' ہو سکتی ہے۔ اسی طرح ﴿سُوْرَةٌ اَنْزَلْنٰھَا﴾ (النور:۱) کی تقدیر عبارت 'فِیْمَا اَوْحَیْنَا اِلَیْكَ سُوْرَةٌ اَنْزَلْنَاھَا' یا 'ھٰذِہٖ سُوْرَةٌ اَنْزَلْنَاھَا' ہو سکتی ہے۔

(iv) فاعل کا حذف: اس کی مثال درج ذیل آیت ہے:

﴿کَلَّا اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِیَ﴾ (القیٰمۃ)

''ہرگز نہیں، جب وہ (رُوح) ہنسلیوں (یعنی حلق کی ہڈیوں) میں پہنچ جائے گی''۔

اس آیت مبارکہ میں 'بَلَغَتْ' فعل کے بعد 'اَلرُّوْحُ' فاعل محذوف ہے۔ آیت مبارکہ ﴿حَتّٰی تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ﴾ (صٓ) میں 'تَوَارَتْ' فعل کے بعد 'اَلشَّمْسُ' فاعل محذوف ہے۔ آیت مبارکہ ﴿فَاِذَا نَزَلَ بِسَاحَتِھِمْ﴾ (الصّٰفّٰت:۱۷۷) میں 'نَزَلَ' فعل کے بعد 'اَلْعَذَابُ' فاعل محذوف ہے۔ اور ﴿فَلَمَّا جَآءَ سُلَیْمٰنَ﴾ (النمل:۳۶) میں 'جَاءَ' کے بعد 'اَلرَّسُوْلُ' فاعل محذوف ہے۔

(v) مضاف کو حذف کرنا اور اس کی جگہ مضاف الیہ کو رکھنا: قرآن میں اس کا استعمال بہت زیادہ ہے۔ اس کی مثال درج ذیل آیت ہے:

﴿وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا﴾ (الاسراء/بنی اسراء یل: ۱۱۰)
''اورا پنی نماز (میں قراءت) کو اونچا نہ کریں اور نہ ہی اس (کی قراءت) کو پست کریں''۔

اس آیت میں مضاف 'قراءة' محذوف ہے اور تقدیر عبارت یوں ہوگی: 'وَلَا تَجْهَرْ بِقَرَاءَةِ صَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِقَرَاءَتِهَا' ۔آیت ﴿حَتّٰى اِذَا فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ﴾ (الانبیاء: ۹۶) میں 'سَدٌّ' مضاف محذوف ہے۔آیت ﴿وَاشْتَعَلَ الرَّاْسُ شَيْبًا﴾ (مریم: ٤) میں 'شَعْرٌ' مضاف محذوف ہے۔آیت ﴿وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ﴾ (البقرۃ: ۱۷۷) میں 'بِرٌّ' مضاف محذوف ہے۔آیت ﴿هَلْ يَسْمَعُوْنَكُمْ اِذْ تَدْعُوْنَ﴾ (الشُّعراء) میں 'دُعَاء' مضاف محذوف ہے ۔آیت ﴿وَاَزْوَاجُهٗ اُمَّهٰتُهُمْ﴾ (الاحزاب: ٦) میں 'مِثْلُ' مضاف محذوف ہے۔آیت ﴿وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰى رُسُلِكَ﴾ (آل عمران: ١٩٤) میں 'اَلْسِنَةِ' مضاف محذوف ہے۔آیت ﴿وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا﴾ (الاعراف: ٨٥) میں 'اَهْلُ' مضاف محذوف ہے۔آیت ﴿وَاُشْرِبُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ﴾ (البقرۃ: ٩٣) میں 'حُبَّ' مضاف محذوف ہے۔آیت ﴿حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ﴾ (المائدۃ: ٣) میں 'اَكْلُ' مضاف محذوف ہے ۔آیت ﴿حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ﴾ (النساء: ٢٣) میں 'نِكَاحُ' مضاف محذوف ہے۔

(vi) مضاف الیہ کا حذف: یہ قرآن میں بہت کم ہے۔اس کی مثال درج ذیل آیت ہے:

﴿تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ﴾ (البقرۃ: ٢٥٣)
''یہ رسول ہیں جن کے بعض کو ہم نے (ان کے) بعض پر فضیلت دی''۔

اس آیت مبارکہ میں دوسرے 'بَعْض' کے بعد ضمیر مضاف الیہ 'هُمْ' محذوف ہے ۔آیت ﴿لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْ بَعْدُ﴾ (الروم: ٤) میں 'قَبْلُ' اور 'بَعْدُ' کے بعد 'ہ' ضمیر محذوف ہے۔

(vii) مضاف اور مضاف الیہ دونوں کو حذف کرنا: اس کی مثال درج ذیل آیت ہے:

﴿تَدُوْرُ اَعْيُنُهُمْ كَالَّذِيْ يُغْشٰى عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ﴾ (الاحزاب: ١٩)
''گھومتی ہیں ان کی آنکھیں جیسا کہ (گھومنا اس کی آنکھ کا) جس پر موت کی غشی طاری کی جاتی ہے''۔

اس آیت کی تقدیر عبارت یوں ہو گی 'تَدُوْرُ اَعْیُنُھُمْ کَدَوَرَانِ الْعَیْنِ الَّذِیْ یُغْشٰی عَلَیْہِ مِنَ الْمَوْتِ'۔ آیت ﴿مَا اَفَآءَ اللّٰہُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ مِنْ اَھْلِ الْقُرٰی﴾ (الحشر:۷) سے مراد 'اَمْوَالُ کُفَّارِ اَھْلِ الْقُرٰی' ہے۔ آیت ﴿فَقَبَضْتُ قَبْضَۃً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ﴾ (طٰہٰ:۹۶) سے مراد 'مِنْ اَثَرِ حَافِرِ فَرَسِ الرَّسُوْلِ' ہے۔ آیت ﴿فَاِنَّھَا مِنْ تَقْوَی الْقُلُوْبِ﴾ (الحج) سے مراد 'مِنْ اَفْعَالِ ذَوِیْ تَقْوَی الْقُلُوْبِ' ہے۔ آیت ﴿وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَکُمْ﴾ (الواقعۃ:۸۲) سے مراد بعض علماء کے نزدیک 'بَدْلَ شُکْرِ رِزْقِکُمْ' ہے۔

(viii) جار اور مجرور دونوں کا حذف: اس کی مثال قرآن کی درج ذیل آیت ہے:

﴿خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَیِّئًا﴾ (التوبۃ:۱۰۲)

''انہوں نے عمل صالح کو خلط ملط کر دیا (برائیوں سے) اور کچھ دوسری برائیوں کو (عمل صالح سے)''۔

اس آیت مبارکہ کی تقدیر عبارت 'خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا بِسَیِّئٍ وَاٰخَرَ سَیِّئًا بِصَالِحٍ' ہے۔ آیت ﴿فَاِنَّہٗ یَعْلَمُ السِّرَّ وَاَخْفٰی﴾ (طٰہٰ) سے مراد 'وَاَخْفٰی مِنَ السِّرِّ' ہے۔ آیت ﴿وَلَذِکْرُ اللّٰہِ اَکْبَرُ﴾ سے مراد 'اَکْبَرُ مِنْ کُلِّ شَیْءٍ' ہے۔

(ix) موصوف کو حذف کرنا: اس کی مثال قرآن کی درج ذیل آیت ہے:

﴿وَعِنْدَھُمْ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ﴾ (الصّٰفّٰت:۴۸)

''اور ان کے پاس نگاہیں نیچی رکھنے والی (حوریں) ہوں گی''۔

اس آیتِ مبارکہ کی تقدیر عبارت یوں ہے: 'وَعِنْدَھُمْ حُوْرٌ قَاصِرَاتُ الطَّرْفِ'۔ آیت ﴿وَحَمَلْنٰہُ عَلٰی ذَاتِ اَلْوَاحٍ وَّدُسُرٍ﴾ (القمر) سے مراد 'سَفِیْنَۃٍ ذَاتِ اَلْوَاحٍ وَّدُسُرٍ' ہے۔ آیت ﴿وَذٰلِکَ دِیْنُ الْقَیِّمَۃِ﴾ (البیّنۃ) سے مراد 'دِیْنُ الْاُمَّۃِ الْقَیِّمَۃِ' ہے۔ آیت ﴿اَنِ اعْمَلْ سٰبِغٰتٍ﴾ (سبا:۱۱) سے مراد 'دُرُوْعًا سَابِغَاتٍ' ہے۔ آیت ﴿وَعَمِلَ صَالِحًا﴾ (البقرۃ:۶۲) سے مراد 'عَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا' ہے۔ آیت ﴿وَدَانِیَۃً عَلَیْھِمْ ظِلٰلُھَا﴾ (الانسان/الدھر:۱۴) سے مراد 'وَجَنَّۃٌ دَانِیَۃٌ' ہے۔ آیت ﴿ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ﴾ (البقرۃ) سے مراد 'لِلْقَوْمِ الْمُتَّقِیْنَ' ہے۔ آیت ﴿وَقَلِیْلٌ مِّنْ عِبَادِیَ الشَّکُوْرُ﴾ (سبا) سے مراد 'اَلْعَبْدُ الشَّکُوْرُ' ہے۔

(x) صفت کا حذف: اس کی مثال قرآن کی درج ذیل آیت ہے:

﴿اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ ۚ﴾ (ھود:٤٦)

''وہ تمہارے (نجات پانے والے) اہل وعیال میں سے نہیں ہے''۔

اس آیت کی تقدیر عبارت یوں ہے: 'لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ النَّاجِيْنَ'۔ آیت ﴿فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا﴾ (الکھف) سے مراد 'وَزْنًا نَافِعًا' ہے۔ آیت ﴿يَاْخُذُ كُلَّ سَفِيْنَةٍ غَصْبًا﴾ (الکھف) سے مراد 'سَفِيْنَةٍ صَالِحَةٍ' ہے۔ آیت ﴿وَكَذَّبَ بِهٖ قَوْمُكَ﴾ (الانعام:٦٦) سے مراد 'قَوْمُكَ الْمُعَانِدُوْنَ' ہے۔ آیت ﴿مَا تَذَرُ مِنْ شَيْءٍ﴾ (الذٰریٰت:٤٢) سے مراد 'شَيْءٍ سُلِّطَتْ عَلَيْهِ' ہے۔ آیت ﴿قَالُوا الْـٰٔنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ ۚ﴾ (البقرۃ:٧١) سے مراد 'الْحَقِّ الْمُبِيْنِ' ہے۔

(xi) معطوف کا حذف: اس سے مراد حرف عطف مثلاً واؤ وغیرہ کے بعد کی عبارت کا محذوف ہونا ہے۔ اس نوع کی مثال درج ذیل آیت ہے:

﴿مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ اَهْلِهٖ﴾ (النمل:٤٩)

''ہم اس کے اہل وعیال (اور اس) کی ہلاکت کے وقت موجود نہیں تھے''۔

اس آیت کی تقدیر عبارت 'مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ اَهْلِهٖ وَمَهْلِكَهٗ' ہے۔

بعض اوقات حرف عطف اور معطوف دونوں ہی محذوف ہوتے ہیں۔ اس کی مثال درج ذیل آیت ہے:

﴿لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ ۭ﴾ (الحدید:١٠)

''نہیں برابر تم میں سے وہ جنہوں نے فتح (مکہ) سے پہلے انفاق کیا اور قتال کیا (اور جنہوں نے فتح مکہ کے بعد انفاق اور قتال کیا)''۔

اس آیت کے بعد 'وَمَنْ اَنْفَقَ مِنْ بَعْدِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ' محذوف ہے۔

(xii) معطوف علیہ کا حذف: اس سے مراد حرف عطف مثلاً واؤ وغیرہ سے پہلے کی عبارت کو حذف کرنا ہے۔ اس نوع کی مثال درج ذیل آیت ہے:

﴿فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِهِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا وَّلَوِ افْتَدٰى بِهٖ ۭ﴾ (آل عمران:٩١)

''پس ہرگز قبول نہ کیا جائے گا ان میں سے کسی ایک سے بھی زمین بھر سونا (اگر وہ اس کا مالک ہو) اور اگر چہ وہ اس کو بدلے میں دے''۔

اس آیت مبارکہ کی تقدیر عبارت 'فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِهِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا مَلَكَهٗ وَلَوِ

اقْتَدٰی بِہٖ' ہے۔ بعض اوقات حرفِ عطف اور معطوف علیہ دونوں محذوف ہوتے ہیں۔ اس کی مثال درج ذیل آیت ہے:

﴿فَمَنْ كَانَ مِنكُم مَّرِيضًا أَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ﴾

(البقرة:١٨٤)

''پس جو تم میں سے مریض ہو یا سفر پر ہو (اور روزہ نہ رکھے) تو دوسرے دنوں میں گنتی پوری کرنا ہے''۔

اس آیت کی تقدیر عبارت 'فَمَنْ كَانَ مِنكُم مَّرِيضًا أَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَأَفْطَرَ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ' ہے۔ آیت ﴿أَنِ اضْرِب بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ ۖ فَانفَلَقَ﴾ (الشُّعراء:٦٣) سے مراد 'أَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ فَضَرَبَ فَانْفَلَقَ' ہے۔

(جاری ہے)

❁❁❁

بقیہ: حکمتِ نبویؐ

تھوڑا سا اس کے گھر بھی بھیج دو''۔

اس سے معلوم ہوا کہ ہمسائیگی کا معاملہ بڑا حساس ہے۔ اس لیے ایسی حرکت کبھی سرزد نہیں ہونی چاہیے جس سے ہمسائے کو اذیت پہنچتی ہو' بلکہ اس کے برعکس ہر وقت اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ ہمسائے کو ہر ممکن طریقے سے نفع پہنچایا جائے۔ ہمسائے کے معاملہ میں جس قدر احتیاط ملحوظ خاطر رکھی جائے کم ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَا آمَنَ بِي مَنْ بَاتَ شَبْعَانَ وَجَارُهُ جَائِعٌ إِلَى جَنْبِهِ وَهُوَ يَعْلَمُ بِهِ))[٦]

''وہ آدمی مجھ پر ایمان نہیں لایا (اور وہ میری جماعت میں نہیں ہے) جو ایسی حالت میں اپنا پیٹ بھر کر رات کو سو جائے کہ اس کے برابر رہنے والا پڑوسی بھوکا ہو اور اس آدمی کو اس کے بھوکا ہونے کی خبر بھی ہو''۔

---

(٦) رواه البزار والطبراني في الكبير۔

اسلام اور فنِ تعمیر

مرزا عمران حیدر ☆

اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو دار العمل بنایا ہے۔ اس نے انسان کو بہت سے اختیارات دے کر دار الامتحان میں اتارا ہے۔ وہ دیکھنا چاہتا ہے کہ کون اس دنیا کے امتحان میں کامیاب رہتا ہے اور کون ہے جو دنیا کی مصروفیات میں اس طرح کھو جاتا ہے کہ اپنا مقصدِ حیات ہی بھلا بیٹھتا ہے۔ انسان کو اس دنیا میں بہت سی نعمتیں حاصل ہیں۔ ان میں سے کچھ ایسی ہیں جن کے بغیر زندگی کا تصور محال ہے اور کچھ نعمتیں انسان محض آسانی اور سہولت کی خاطر استعمال کرتا ہے۔ یہ تمام احسانات اللہ ربّ العالمین کی طرف سے ہیں۔ جب وہ کسی کو نعمت دیتا ہے تو اس کے صحیح استعمال کا تقاضا بھی کرتا ہے۔ کسی نعمت کی قدر نہ کرنا یعنی اسے استعمال کرنے کی بجائے ضائع کر دینا یا اس کا غلط استعمال کرنا' دونوں رویے ہی اللہ کے ہاں ناپسندیدہ ہیں۔ ان نعمتوں کے حصول پر تمام انسانوں کا یکساں حق ہے۔ ایک اسلامی ریاست پر تمام افراد کو روزی کمانے کے برابر حقوق حاصل ہوتے ہیں۔ البتہ صلاحیتوں کے اختلاف اور اللہ تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ کے تحت کسی کو ان کا وافر حصہ ملتا ہے اور کچھ ان سے محروم رہتے ہیں۔ اس فطری تقسیم کے باوصف اسلام اپنے متبعین کی ایسی تربیت کرتا ہے جس سے افراد میں ٹکراؤ پیدا نہیں ہوتا اور نہ ہی مسلمان دنیا کی رنگینیوں میں کھو کر آخرت کو فراموش کر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ایک نعمت گھر اور مکان ہے۔ رہائش کے لیے گھر انسان کی بنیادی ضرورت ہے جو اسے موسمی تغیرات کی سختیوں سے بچاتا ہے' جان و مال کی حفاظت کا ذریعہ ہے اور اپنی اور اہل خانہ کی ان ضروریات کو پوری کرنے کے علاوہ انسان کے لیے اس میں پناہ گاہ اور سکون کا مقام ہے۔

اسلام ایک عالمگیر دین ہے' اس کی تعلیمات اور احکام کسی علاقے' رنگ اور نسل کے ساتھ خاص نہیں ہیں اور اس میں زندگی کے ہر گوشے کے لیے راہنمائی موجود ہے۔ یہی وجہ ہے

☆ شعبہ تحقیق اسلامی' قرآن اکیڈمی لاہور

کہ اسلام نے تعمیرات کے بارے میں بھی ہدایات دی ہیں لیکن کوئی خاص ہیئت اور نقشہ نہیں پیش کیا تا کہ ہر علاقے کے لوگ اپنے اپنے حالات اور ضرورتوں کے مطابق اسلام کی ہدایات کی روشنی میں عمارات تعمیر کر سکیں۔ عمارات میں اسلام نے مسجد کو بنیادی حیثیت دی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے مدینہ منورہ آ کر اپنے گھر سے پہلے اللہ کے گھر یعنی مسجد کی تعمیر فرمائی۔ مسجد کی تعمیر کے لیے بھی اسلام نے کوئی خاص شکل نہیں بتائی ہے۔ کسی بھی مقام پر امام کو آگے کر کے قبلہ رُخ ہو کر نماز ادا کی جا سکتی ہے۔ اس میں اسلام کی سادگی اور عالمگیریت کا راز پنہاں ہے۔ اسلام اسراف کو سخت ناپسند کرتا ہے اور تبذیر کرنے والوں کے بارے میں تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ﴾

''یقیناً تبذیر کرنے والے (یعنی محض اپنی دولت کے اظہار کے لیے بے جا خرچ کرنے والے) شیطان کے بھائی ہیں''۔

بلاوجہ اور بلاضرورت فلک بوس عمارات کی تعمیر آخرت سے بے خوفی اور دنیا میں کھو جانے کی علامت ہے۔ مسجد عبادت کی جگہ ہے۔ اس میں تھوڑے سے اضافے سے صفہ کی طرز پر درس گاہ بنائی جا سکتی ہے۔ مزید کچھ اضافے سے حکومتی اور انتظامی ضروریات پوری کی جا سکتی ہیں' تا کہ مسجد کے قرب سے خوفِ خدا بھی رہے اور عمارات کی تعمیر میں سرمائے اور صلاحیتوں کے ضیاع سے بھی بچا جا سکے۔ فن تعمیر اور عمارات کی ہدایات کے لیے ہمیں رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے طرزِ زندگی کو دیکھنا اور اپنانا ہو گا۔ تمدنی ارتقاء کے باوجود وہ ہدایات آج بھی ہمارے لیے مشعل راہ ہیں۔ ان سے انحراف دین سے دوری ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بعد مسلمان حکمرانوں نے فن تعمیر میں ایسے ایسے جوہر دکھائے کہ ان کی تعمیرات کا شمار عجائباتِ عالم میں ہونے لگا۔ ابتدا میں مساجد کی تعمیر' پھر محلات' مختلف ناموں سے منسوب یادگاریں' مقبرے' مزارات اور علامتی تعمیرات میں اُمت کی متاع کو کھپایا گیا اور اس کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ اسے مسلم حکمرانوں کی کارفرمائی تو کہا جا سکتا ہے' اسلامی تہذیب و تمدن سے اس کا دُور کا بھی واسطہ نہیں۔ ضرورت کی عمارت اور پلازوں کو مضبوط بنانا انسانی جان کی حفاظت کے لیے ضروری ہے' لیکن پتھر اور سرامکس کی ٹائلوں اور تزئین و آرائش پر پانی کی طرح روپیہ بہانا سراسر اسراف ہے۔ اچھے ادارے بنانے کے لیے لوگ بڑی بڑی عمارات تعمیر کرتے ہیں۔ لیکن یہ بات یاد رہے کہ ادارے عمارتوں سے نہیں' افراد سے بنتے' پھلتے اور

پھولتے ہیں۔ کسی قوم کی کامیابی کا راز بلند و بالا عمارتوں میں نہیں' تربیت یافتہ افراد میں پوشیدہ ہے۔ اللہ کا عذاب آئے یا دشمن حملہ کرے' عمارتیں اقوام کو تحفظ نہیں دیا کرتیں۔ قرآن میں موجود سابقہ اقوام کے قصے اور دورِ حاضر میں زمینی حقائق اس کے شاہد ہیں۔ تعمیر کو فن کہہ کر اور انسانی جمالیات کے اظہار کے لیے مٹی' پانی اور پتھر وغیرہ میں سرمایہ ضائع کر کے اُمت کو مسائل کی دلدل میں دھکیلا جا رہا ہے۔ زمین کی آسمان کو چھوتی ہوئی قیمت اور ناقابل برداشت تعمیراتی اخراجات عام آدمی کی پہنچ سے باہر ہو چکے ہیں۔ پندرہ بیس ہزار روپے ماہانہ کمانے والا بھی رہائش کے لیے شہر میں مناسب گھر بنانے کا تصور ہی نہیں کر سکتا۔

عمدہ فن تعمیر کے اظہار کے لیے جس سرعت سے تعمیرات کا سلسلہ جاری ہے اس کے نقصانات روزِ روشن کی طرح عیاں ہیں۔ زرعی زمین رہائشی اور تجارتی مقاصد میں استعمال ہونے کی وجہ سے کم ہو رہی ہے جس کا زراعت پر برا اثر پڑے گا۔ ہاؤسنگ سکیموں کی کثرت سے زمین کی قیمت میں مصنوعی طور پر اضافہ ہو رہا ہے۔ تجارتی نقطۂ نظر سے پلاٹوں کی خرید و فروخت عروج پر ہے' جبکہ اتنے مکانات کی نہ ضرورت ہے اور نہ ہی تعمیر کیے جاتے ہیں' محض پیسہ کمانا مقصود ہے۔ تعمیراتی سامان کی تجارت میں اضافہ تو ہوا ہے' لیکن متوسط اور غریب طبقہ کی پہنچ سے باہر بھی ہو رہا ہے۔ قیمتی محلات کی تعمیر سے ارتکازِ زر کا مسئلہ پیدا ہو رہا ہے جو ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ تعمیراتی جائیداد سے محروم افراد میں احساسِ کمتری سمیت بے شمار مسائل پیدا ہو رہے ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر تعمیرات کے کنویں میں خزانے دھکیلنے کے بعد اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کے لیے کچھ نہیں بچتا۔

اب ہم فن تعمیر کی تاریخ' ارتقاء' دائرہ کار اور حیثیت کا جائزہ لیتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کے دور میں عرب کا طرزِ تعمیر

رسول اللہ ﷺ کی ولادت باسعادت کے وقت عربوں کی کیفیت یہ تھی کہ گلہ بانی یا تجارت ان کا پیشہ تھا۔ سنگلاخ پہاڑوں اور وسیع و عریض ریگستانوں کے اس علاقے میں ان کے پاس کرنے کا کوئی تیسرا کام نہ تھا۔ البتہ مدینہ اور طائف جیسے بعض علاقوں میں تھوڑی بہت زراعت بھی پائی جاتی تھی۔ تجارت کے پیشے سے وابستہ افراد شہروں میں رہتے اور چرواہے پانی اور سبزے کی تلاش میں سرگرداں رہتے' جہاں کہیں سبزہ اور پانی نظر آتا وہیں ڈیرے جما لیتے اور ان وسائل کے ختم ہونے پر نئے ذخیرے کی تلاش میں پھر رخت سفر باندھ لیتے۔

تجارتی سفروں میں شام اور ایران کے متمدن اور تہذیب یافتہ علاقوں میں ان کا آنا جانا تو بکثرت ہوتا' لیکن پڑھنے لکھنے کی فکر سے عاری اس قوم میں ان جدید تمدنی علاقوں کے نقش قدم پر چلنے کا کبھی تصور بھی نہیں پایا جاتا تھا۔ ان حالات میں عربوں کے ہاں فن تعمیر کے حوالے سے کوئی خاص تصور نہیں پایا جاتا تھا۔ تعمیرات میں گھر ہی ان کا بنیادی ہدف ٹھہرتا اور اس میں بھی سادگی ہی نظر آتی ہے۔ اُس وقت گھر عموماً دو طرح کے ہوتے تھے اور اُن میں رہنے والوں کو ان کی مناسبت سے اہل مدر اور اہل وبر کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔(۱)

اھل المدر : اہل المدر یعنی شہروں اور بستیوں والوں کے گھر عموماً کچی اینٹوں سے بنے ہوئے ہوتے تھے۔

اھل الوبر : اہل الوبر یعنی خانہ بدوشوں کی طرح زندگی گزارنے والوں کے گھر کھجور کے تنوں' شاخوں اور گھاس پھونس کے بنے ہوئے ہوتے تھے۔

اہل الوبر کے گھروں کی کیفیت کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔ اہل المدر کے گھر کچی اینٹوں سے بنے ہوتے' البتہ کہیں پتھر کا استعمال بھی ہو جاتا تھا۔ دروازے لکڑی کے ہوتے یا پھر دروازوں کی جگہ پر کمبل لٹکا لیے جاتے تھے۔ مدینے کی تہذیب میں اگر گھر باغ میں بنائے جاتے تو کمروں کے باہر کھلا صحن بھی موجود ہوتا جس کی بیرونی دیواروں کے طور پر باڑ لگا دی جاتی تھی۔ باہم ملے ہوئے چند کمروں پر مشتمل ان گھروں میں کہیں کہیں گراؤنڈ فلور کے اوپر دوسری منزل بھی تعمیر کر لی جاتی تھی' لیکن ایسا بہت کم تھا۔ مدینہ میں جب رسول اللہ ﷺ نے اپنی بیویوں سے ایلاء کیا تو آپؐ ایسے ہی گھر کی دوسری منزل میں منتقل ہو گئے تھے۔(۲)

گھروں کے علاوہ اجتماعی معاشرتی مقامات کے لیے مکہ میں دار الندوہ اور مدینہ میں سقیفہ بنو ساعدہ کی مثال دی جا سکتی ہے۔ یہ دونوں جگہیں ذاتی گھروں سے عمدہ تعمیر نہیں کی گئی تھیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ان مقامات میں جگہ وسیع تھی اور زیادہ افراد کے سمانے کی گنجائش موجود تھی۔ بت پرستی اگرچہ عرب کے رگ و ریشے میں سمائی ہوئی تھی لیکن کہیں الگ معبد کا ذکر نہیں ملتا۔ گھر کے ہی کسی حصے میں بت ڈال دیا جاتا تھا اور زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا تھا کہ اس پر کپڑا ڈال کر اسے چھپا لیا جاتا تھا۔

ایسے میں بیت اللہ وہ واحد جگہ تھی جو تمام عرب کا مرکز اور مرجع تھی۔ اس مرکز کی تعمیر کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ نشیبی جگہ میں واقع ہونے کی وجہ سے بارش کا پانی جمع ہو

جاتا جس سے بیت اللہ کی عمارت اس قدر خستہ حال ہوگئی کہ اسے منہدم کر کے نئی عمارت بنانا ناگزیر ہوگیا۔ اسی دوران ایک تجارتی بحری جہاز جدہ کے ساحل پر ریت میں پھنس گیا۔ جب اس کو واپس گہرے پانیوں میں دھکیلنا ممکن نہ رہا تو مکہ کے لوگوں نے بیت اللہ کی تعمیر کی غرض سے اسے خرید لیا اور اس کے لکڑی کے تختے اکھاڑ کر مکہ لے آئے۔ اب بیت اللہ کی تعمیر شروع ہوئی۔ چونکہ اس بات کا اعلان کیا گیا تھا کہ اس کی تعمیر میں صرف حلال اور جائز پیسہ ہی لگایا جا سکتا ہے' اس لیے وسائل کی کمی کی وجہ سے جب قواعد ابراہیمی پر بیت اللہ کو اٹھایا گیا تو اس کا حطیم والا حصہ چھوڑ دیا گیا' بقیہ حصے کی تعمیر اس طرح کی گئی کہ ایک ردہ (تہہ) پتھر کا اور ایک لکڑی کا رکھا جاتا۔ اسی دوران حجر اسود کو رسول اللہ ﷺ کے ہاتھوں نصب کرنے کا مشہور واقعہ پیش آیا۔ اٹھارہ ہاتھ بلند بیت اللہ کی عمارت تعمیر ہوئی۔ چھ ستونوں پر اس کی چھت ڈالی گئی۔ دروازہ زمین سے قدرے بلند تھا۔ چھت کے پانی کے اخراج کے لیے ایک پرنالہ لگایا گیا جو ''میزاب رحمت'' کے نام سے معروف ہے۔ بیت اللہ کے احاطہ کے ارد گرد تقریباً انسانی قد کے برابر بیرونی دیوار تعمیر کی گئی۔ اس احاطے میں مشرکین مکہ نے بت سجا رکھے تھے۔[۳]

فن تعمیر کا یہ واحد شاہکار تھا جو عرب میں پایا جاتا تھا۔ اس کی تعمیر پتھر اور لکڑی سے کرنے کا جو انداز اختیار کیا گیا یہ طریقۂ تعمیر اُس وقت حبشہ کے علاقے میں رائج تھا۔ عرب کے لوگوں کا ایران و شام کے علاقے میں آنا جانا بھی عام تھا' لیکن انہوں نے حبشہ کے فن تعمیر کو پسند کرتے ہوئے اسے اختیار کیا۔

ادھر مدینہ میں بھی تعمیرات کے سلسلے میں قریب قریب مکہ جیسا معاملہ ہی تھا۔ البتہ زراعت اور کچھ پانی کی موجودگی کی وجہ سے رہائشی مکان مکہ کی نسبت کچھ بہتر تھے۔ کہیں کہیں دوسری منزل کا بھی وجود ملتا ہے' جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ مدینہ میں میٹھے پانی کے کنوؤں کی قلت اور بہت سے ناکارہ کنوؤں سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ کنویں کی تعمیر و مرمت کوئی آسان کام نہ تھا۔ اہل زراعت باغات کے اندر اپنے مکان بناتے۔ مکانات کی تعمیر میں بنیادی طور پر اس بات کا خیال رکھا جاتا کہ اس سے گھریلو خواتین کو مکمل باپردہ ماحول میسر آئے (بیع العرایا کے جواز کی وجہ یہی ہے)۔

مدینہ کے قریب ہی رہائش پذیر یہودی مضبوط قلعے تعمیر کر کے ان میں رہتے تھے۔ ان کے قلعے اتنے مضبوط ہوتے کہ معمولی لشکروں کے لیے انہیں سر کرنا ممکن نہ تھا۔ تعمیرات کے

سلسلے میں یہودیوں کا یہ انداز عرب کے عمومی انداز کے برعکس تھا۔ یہودی اللہ کے آخری نبی کے انتظار میں اپنی کتب کی رہنمائی میں دار الہجرت یعنی مدینہ میں آ کر بسے تھے تا کہ وہ آنے والے نبی کے ساتھ مل کر کافروں کا مقابلہ کر سکیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان میں سے کم ہی لوگوں کو اس کارِ خیر کی توفیق مل سکی۔ اس لیے قلعوں کی تعمیر کا یہ طریقہ وہ اپنے آبائی علاقوں سے اپنے ساتھ لے کر آئے تھے۔ وگرنہ یہ طریقہ عربوں کے مزاج سے ذرا بھی میل نہیں رکھتا۔

رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دور میں دیگر دنیا کا فن تعمیر

ہر علاقے نے اپنے اپنے ماحول' ضرورت اور وسائل کو پیش نظر رکھ کر اپنی تعمیراتی ضرورتیں پوری کی ہیں۔ بنیادی ضرورت پوری ہونے کے بعد مال دار اور حکمران طبقے نے تفاخر اور اپنی برتری ثابت کرنے کے لیے فن تعمیر میں بھی تکلف' تصنع اور اسراف کا مظاہرہ کیا ہے۔ ویسے تو ہر علاقے کے فن تعمیر کا جائزہ لینے کے لیے مستقل مضمون کی ضرورت ہے' تاہم اختصار سے کام لیتے ہوئے ہم چند باتوں کی طرف اشارہ کریں گے۔

غیر مسلم علاقوں میں سفارت کاری کے لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے آنے جانے سے معلوم ہوا کہ اس وقت شام اور ایران میں بادشاہوں نے بڑے بڑے محلات تعمیر کروا رکھے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں ایران کی فتح کے لیے نعمان بن مقرن رضی اللہ عنہ کو ایران کے علاقے نہاوند کی طرف بھیجا۔ انہوں نے حکمران کے پاس بطور سفیر حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کو بھیجا۔ المسعودی بیان کرتا ہے:

> ''جب وہ دربار میں پہنچے تو دیکھا کہ وہ ایک مرصع تخت پر بیٹھا ہے۔ اس کا تخت بادشاہوں جیسا مذہب و مطلا ہے اور اس پر بیش قیمت جواہرات لگے ہوئے ہیں' اور اس کے علاوہ اس کے سر پر مرصع تاج ہے۔ حکمران کے دائیں بائیں اس کے بیٹے زرنگار نشستوں پر بیٹھے ہیں اور وہ بھی زرق برق لباس میں ملبوس ہیں۔ اسی طرح اس کے اہل دربار بھی اپنے اپنے مرتبے کے مطابق دائیں بائیں اور سامنے اعلیٰ نشستوں پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ مغیرہ اور ان کے دونوں ساتھی دربار ہال کے دروازے سے داخل ہو کر بڑی بے باکی کے ساتھ شاہی تخت تک جا پہنچے''۔ (۴)

اس پورے واقعہ میں ایک بڑے محل کی تعمیر میں لکڑی' لوہے اور پتھروں کی تراش خراش کے فن کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قاتل ابو لؤلؤ جسے ایک صحابی کی سفارش

پر مدینے میں رہنے کی اجازت دی گئی تھی' ایران کا مجوسی تھا اور لوہے و لکڑی پر نقش و نگار کے فن میں تاک تھا۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے جب مسجد نبوی کی توسیع و تزئین فرمائی تو اس کی تعمیر میں پہلی مرتبہ منقش پتھروں کو استعمال کیا گیا جو ہند سے منگوائے گئے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہند میں تعمیراتی مقاصد کے لیے منقش پتھروں کا رواج تھا۔ بڑے بڑے مندر اُن کے فن تعمیر کا شاہکار تھے۔

عمارت کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کی رہنمائی اور صحابہ کرامؓ کا طرزِ عمل

اسلام اس فانی دنیا کو دارالعمل قرار دیتا ہے۔ یہ دارالعمل میں رہنے کے لیے ایک انسان کو مسافر سے تشبیہ دیتا ہے' جس کا مطلب ہے کہ ایک مسافر اپنے سفر کے دوران جس قدر اہتمام کرتا ہے ایک مسلمان کو دنیا میں رہتے ہوئے بس اتنا ہی اہتمام کرنا چاہیے' اس سے زیادہ کی تگ ودو میں نہیں لگنا چاہیے۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ کوئی مسافر کسی پڑاؤ پر کبھی کوئی مضبوط اور مستقل عمارت کا تصور نہیں کر سکتا۔ وہ تو کسی مقام پر اتنا انتظام کرتا ہے جس سے وہ دو گھڑی آرام کر سکے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے میرے کندھے کو پکڑ کر فرمایا:

((كُنْ فِي الدُّنْيَا كَأَنَّكَ غَرِيبٌ أَوْ عَابِرُ سَبِيلٍ)) وَكَانَ ابْنُ عُمَرَ يَقُولُ: إِذَا أَمْسَيْتَ فَلَا تَنْتَظِرِ الصَّبَاحَ وَإِذَا أَصْبَحْتَ فَلَا تَنْتَظِرِ الْمَسَاءَ وَخُذْ مِنْ صِحَّتِكَ لِمَرَضِكَ وَمِنْ حَيَاتِكَ لِمَوْتِكَ (۵)

''دنیا میں ایسے رہو جیسے تم اجنبی ہو یا مسافر ہو''۔ اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرمایا کرتے تھے: ''جب تم شام کرو تو صبح کا انتظار نہ کرو اور جب تم صبح کرو تو شام کا انتظار نہ کرو۔ اپنی صحت کی حالت میں بیماری کا سامان کر لو (یعنی صحت کو غنیمت جانتے ہوئے زیادہ سے زیادہ اعمال کر لو) اور اپنی زندگی میں اپنی موت کا سامان کر لو''۔

ایک مسلمان کو دنیا کے بارے میں یہی انداز اختیار کرنا چاہیے۔ دنیا سے بے رغبتی کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لَا تَتَّخِذُوا الضَّيْعَةَ فَتَرْغَبُوا فِي الدُّنْيَا))(٦)

''تم باغات (زراعت اور تجارت) کو نہ تھام لو' اس طرح تم دنیا میں رغبت کرنے

لگو گے''۔

اس دنیا میں کسی انسان کو بقاء حاصل نہیں۔ اس اٹل حقیقت کو تسلیم کر لینے کے بعد ہمارا طرزِ عمل بھی ایسا ہونا چاہیے جس سے اس اٹل حقیقت کی نفی نہ ہوتی ہو' بلکہ ہمارا عمل اس حقیقت کی غمازی کرنے والا ہونا چاہیے۔ دنیا و مافیہا کی حقیقت کے بارے میں کیسا نایاب موتی یہ حدیث طیبہ ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((يَقُوْلُ الْعَبْدُ مَالِيْ مَالِيْ' اِنَّمَا لَهٗ مِنْ مَالِهٖ ثَلَاثٌ :مَا اَكَلَ فَاَفْنٰى اَوْ لَبِسَ فَاَبْلٰى اَوْ اَعْطٰى فَاقْتَنٰى وَمَا سِوٰى ذٰلِكَ فَهُوَ ذَاهِبٌ وَتَارِكُهٗ لِلنَّاسِ))(۷)

''بندہ کہتا ہے میرا مال میرا مال! جبکہ اس کے لیے اس کے مال میں سے بس تین چیزیں ہیں: جو کھایا پھر ختم کر دیا' یا جو پہنا پھر بوسیدہ کر دیا یا جو (صدقہ) دیا اور اور اُسے آخرت کے لیے ذخیرہ کر لیا۔ اس کے علاوہ جو کچھ بھی ہے وہ جانے والا ہے اور وہ اسے لوگوں کے لیے چھوڑنے والا ہے''۔

اس حدیث طیبہ سے انسان کے مال کی حقیقت سمجھ لینے کے بعد ذرا غور فرمائیے کہ انسان کے لاکھوں اور کروڑوں کے رہائشی مکانات اور قیمتی گاڑیوں کی کیا حقیقت رہ جاتی ہے! اور پھر ان کے حصول اور ان میں مقابلے کے لیے انسان کیسے کیسے پاپڑ بیلتا ہے اور حق و ناحق اور حلال و حرام کی تمیز اس کی آنکھوں سے اٹھ جاتی ہے۔

اب ہم تعمیرات کے حوالے سے چند احادیث کا مطالعہ کرتے ہیں:

حضرت حارثہ بن مضرب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

اَتَيْنَا خَبَّابًا نَعُوْدُهٗ وَقَدِ اكْتَوٰى سَبْعَ كَيَّاتٍ فَقَالَ :لَقَدْ تَطَاوَلَ مَرَضِيْ وَلَوْلَا اَنِّيْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ:((لَا تَمَنَّوُا الْمَوْتَ)) لَتَمَنَّيْتُ' وَقَالَ :((يُؤْجَرُ الرَّجُلُ فِيْ نَفَقَتِهٖ كُلِّهَا اِلَّا التُّرَابَ —— اَوْ قَالَ :فِي الْبِنَاءِ)) (۸)

''ہم حضرت خباب رضی اللہ عنہ کی عیادت کے لیے آئے۔ آپ سات مرتبہ پچھنے لگوا چکے تھے۔ آپؓ نے فرمایا: میری بیماری لمبی ہوگئی ہے' اور اگر میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے نہ سنا ہوتا کہ: ''موت کی تمنا نہ کرو'' تو میں موت کی تمنا لازماً کرتا۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''آدمی کے ہر خرچ کا اسے اجر دیا جاتا ہے سوائے مٹی کے —— یا

آپؐ نے فرمایا: ''سوائے عمارت کے''۔
گویا انسان کا نیک مقاصد کے علاوہ نان نفقہ کے لیے خرچ کیا ہوا پیسہ بھی اس کے نامۂ اعمال میں جمع ہو جاتا ہے' جس کا اللہ تعالیٰ اجر عطا فرمائیں گے۔ لیکن مٹی میں یا عمارات میں خرچ کیے ہوئے پیسے کی اللہ کے ہاں کوئی قدر و قیمت نہیں ہے' وہ ضائع' بے کار اور اجر سے محروم ہے۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اَلنَّفَقَةُ كُلُّهَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اِلَّا الْبِنَاءَ فَلَا خَیْرَ فِیْهِ))(۹)

''ہر طرح کا خرچ کرنا اللہ کے راستے میں ہے' سوائے عمارت کے' اس میں کوئی خیر نہیں ہے۔''

اسی معنی کی ایک اور خبر بھی ہے جو سند کے اعتبار سے کمزور ہے۔ حضرت ابراہیم نخعیؒ فرماتے ہیں:

اَلْبِنَاءُ كُلُّهٗ وَبَالٌ قُلْتُ اَرَاَیْتَ مَالَا بُدَّ مِنْهُ؟ قَالَ لَا اَجْرَ وَلَا وِزْرَ(۱۰)

''عمارت سراپا وبال ہے۔ (راوی کہتے ہیں) میں نے کہا آپ کا کیا خیال ہے جس کے بغیر چارہ نہ ہو؟ فرمایا: نہ تو اجر ہے اور نہ ہی کوئی بوجھ ہے''۔

صاحب تحفۃ الاحوذی فرماتے ہیں:

''عمارات کی تعمیر کا کوئی اجر و ثواب نہیں ہے ـــــ البتہ ایسی عمارات جن کے بنانے سے اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنا مقصود ہو وہ اجر سے خالی نہیں' مثلاً مسجد' مدرسہ اور رباط کی تعمیر''۔

شارح ترمذی کی بات سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ اسلام کی شان و شوکت کے لیے مساجد اور ویلفیئر کے کاموں کے لیے مطلوبہ عمارات کی تعمیر اجر و ثواب کا باعث ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

مَرَرْتُ مَعَ النَّبِیِّ ﷺ فِیْ طَرِیْقٍ مِنْ طُرُقِ الْمَدِیْنَةِ فَرَاٰی قُبَّةً مِنْ لَبِنٍ فَقَالَ: ((لِمَنْ هٰذِهٖ؟)) فَقُلْتُ: لِفُلَانٍ، فَقَالَ: ((اَمَا اِنَّ كُلَّ بِنَاءٍ هَدٌّ عَلٰی صَاحِبِهٖ یَوْمَ الْقِیَامَةِ اِلَّا مَا كَانَ فِیْ مَسْجِدٍ ـــ اَوْ قَالَ: فِیْ بِنَاءِ مَسْجِدٍ)) شَكَّ اَسْوَدُ ـــ ثُمَّ مَرَّ فَلَمْ یَلْقَهَا فَقَالَ: ((مَا فَعَلَتِ الْقُبَّةُ؟)) قُلْتُ بَلَغَ صَاحِبَهَا مَا قُلْتَ فَهَدَمَهَا' قَالَ فَقَالَ: ((رَحِمَهُ اللّٰهُ))(۱۱)

''میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مدینے کے راستوں میں سے ایک راستے سے گزرا۔

آپؐ نے اینٹوں کا بنا ہوا قبہ دیکھا تو فرمایا: ''یہ کس کا ہے؟'' میں نے کہا فلاں کا ہے۔ آپؐ نے فرمایا: ''قیامت کے دن ہر عمارت اپنے مالک کے لیے وبال ہوگی' سوائے مسجد کے ——— یا فرمایا: مسجد بنانے کے''۔ اسود (راوی) کو شک ہے (کہ آپؐ نے مسجد کہا یا تعمیرِ مسجد کہا)۔ پھر آپؐ دوبارہ گزرے تو آپؐ نے وہ (قبہ) نہ پایا تو فرمایا: ''قبے کا کیا بنا؟'' میں نے کہا: اس کے مالک کو آپؐ کی بات پہنچی تو اس نے اسے گرا دیا۔ صحابی بیان کرتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: ''اللہ اس پر رحم کرے!''

صحابیؓ کا اپنی عمارت میں قبہ (گنبد) تعمیر کرنا اس کی زیب و زینت کے لیے تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اسے ناپسند فرمایا اور ساتھ ہی وضاحت فرما دی کہ اس قسم کی عمارات جن کا عملی طور پر کوئی فائدہ نہیں' جو محض خوبصورتی کے لیے یا فخر و تکبر اور نمود و نمائش کے لیے ہیں' تو نہ صرف یہ کہ مسلمان کو ان کا کوئی فائدہ نہیں بلکہ الٹا اس کے لیے وبال بن جائیں گی۔ آپؐ نے مسجد یا مسجد کی تعمیر کو اس سے مستثنیٰ کیا ہے' کیونکہ وہ شعائرِ اسلام میں سے ہے۔ اس کی فضیلت اِن شاء اللہ عنقریب بیان کی جائے گی۔

اسی طرح حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بھی بلا مقصد عمارت کی تعمیر ناپسند کرتے تھے' بلکہ آپؓ تو اس پر سزا بھی دیا کرتے تھے۔ عمر فاروقؓ عامل مقرر کرتے وقت ان کے حقوق و فرائض لکھ کر ساتھ دیتے اور عدمِ تعمیل کی صورت میں پوچھ گچھ کرتے۔ کبھی کبھی عمال کی شکایت پر تحقیقاتی کمیشن مقرر کرتے تھے۔ عمال کو ترفع' شان و شوکت' عجب و غرور پیدا کرنے والی چیزوں سے روکتے تھے۔ جس عامل کے بارے میں سنتے کہ عوام اس کے یہاں بار نہیں پاتے اسے فوراً موقوف کر دیتے تھے۔ عامل مصر حضرت عیاض بن غنم رضی اللہ عنہ کو بیش قیمت لباس پہننے اور محل بنانے کی شکایت پر کمبل کا کرتہ پہنوا کر ان سے بکریاں چروائیں۔ (۱۲)

عامل کوفہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے مکان بنوایا جس میں ڈیوڑھی تھی۔ حضرت عمرؓ کو خبر ہوئی تو ڈیوڑھی میں آگ لگوا دی۔ (۱۳)

ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جو مکانات تعمیر کروائے وہ موجودہ دور کے محلات کی طرح ہرگز نہ تھے۔ ان کی کیفیت کا اس بات سے آسانی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ غیر ضروری ڈیوڑھی کو آگ لگا دی گئی اور ان عمارات کی تعمیر پر عمال کو معزول کر دیا گیا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے سامنے مزاجِ نبی ﷺ اور اسلامی تعلیمات تھیں جن کے پیشِ نظر وہ سمجھتے تھے کہ بلا مقصد عمارت کی تعمیر کے لیے اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔

تعمیر مسجد کی فضیلت

حضرت عائشہ ؓ سے مروی ہے کہ:

اَمَرَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ بِبِنَاءِ الْمَسَاجِدِ فِی الدُّوْرِ وَاَنْ تُنَظَّفَ وَتُطَیَّبَ (۱۴)

''رسول اللہ ﷺ نے محلوں میں مساجد بنانے' انہیں پاک صاف رکھنے اور خوشبودار رکھنے کا حکم ارشاد فرمایا۔''

سابقہ دلائل میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے فرمان کے مطابق تعمیرات میں سے صرف مساجد کی تعمیر میں ہی اجر وثواب ہے۔ اب ہم اس حدیث میں دیکھ رہے ہیں کہ آپؐ مساجد کی تعمیر کا حکم دے رہے ہیں اور یہ کہ مساجد مسلمانوں کے تمام محلوں میں ہونی چاہئیں۔ مسلمانوں کا کوئی علاقہ مساجد سے خالی نہیں ہونا چاہیے۔ ایک اور حدیث مبارکہ میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب کسی لشکر کو روانہ فرماتے تو حکم دیتے کہ کسی بستی پر حملہ کرنے سے پہلے دیکھنا وہاں سے اذان کی آواز تو نہیں آ رہی۔ اگر اذان کی آواز آ جائے تو اس پر حملہ نہ کرنا۔ گویا مسجد اسلام کے شعائر میں سے ہے۔ مسلمانوں کے تمام علاقوں میں ان کا قیام اور احترام فرض ہے۔ یہ مسلمانوں کی علامت' پہچان اور یہی مسلم معاشرے کا کلچر ہے۔ رسول اللہ ﷺ جب ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے تو یہاں آتے ہی آپؐ نے سب سے پہلے مسجد نبویؐ کی تعمیر فرمائی۔ آپؐ نے نہ صرف اس کام کی مکمل نگرانی فرمائی بلکہ خود بنفس نفیس اس کی تعمیر میں عملی شرکت بھی فرمائی۔ اس طرح آپؐ نے سابقہ انبیاء حضرت آدمؑ حضرت ابراہیمؑ حضرت اسماعیل اور حضرت سلیمان ؑ کے مبارک مشن کی تکمیل فرمائی اور اب یہ سعادت اُمت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے پاس ہے۔ حضرت عبیداللہ خولانی سے مروی ہے کہ:

اَنَّہٗ سَمِعَ عُثْمَانَ بْنَ عَفَّانَ یَقُوْلُ عِنْدَ قَوْلِ النَّاسِ فِیْہِ حِیْنَ بَنٰی مَسْجِدَ الرَّسُوْلِ ﷺ: اِنَّکُمْ اَکْثَرْتُمْ وَاِنِّیْ سَمِعْتُ النَّبِیَّ ﷺ یَقُوْلُ: ((مَنْ بَنٰی مَسْجِدًا ـــ قَالَ بُکَیْرٌ حَسِبْتُ اَنَّہٗ قَالَ ـــ یَبْتَغِیْ بِہٖ وَجْہَ اللّٰہِ بَنَی اللّٰہُ لَہٗ مِثْلَہٗ فِی الْجَنَّۃِ)) (۱۵)

''مسجد نبویؐ کی تعمیر نو کے وقت جب لوگ حضرت عثمان غنیؓ کے بارے میں باتیں کر رہے تھے تو آپؓ نے فرمایا:'' تم (مسجد نبوی کی تعمیر نو سے روکتے ہوئے) زیادہ تاکید کرتے ہو جبکہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا:'' جس نے مسجد بنائی

جس کے ساتھ وہ اللہ کی رضامندی چاہتا ہے' تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے اس کی مثل جنت میں بنائے گا''۔

مسجد کی تعمیر اور اس کی دیکھ بھال ایسے کام جب اللہ تعالیٰ کی رضامندی تلاش کرتے ہوئے کیے جائیں گے تو اللہ ان کے کرنے والے کے لیے جنت میں گھر بنائے گا۔ ''مثلہ'' سے یہ ترغیب ملتی ہے کہ مسجد اچھی سے اچھی بنانی چاہیے تاکہ جب اللہ تعالیٰ جنت میں گھر بنائے تو وہ بھی اچھا ہو۔ لیکن یہ بات ملحوظ خاطر رہنی چاہیے کہ اس سلسلے میں شریعت کے دوسرے احکام کی خلاف ورزی نہیں ہونی چاہیے۔ اگر مسجد کی تعمیر میں شرعی احکام کی خلاف ورزی کی گئی تو اس پر اجر ملنے کی بجائے محنت کے ضائع ہونے کا خدشہ ہے۔ رہی بات جنت کے عمدہ گھر کے حصول کی' تو جنت میں ایک بالشت جگہ کا ملنا دنیا و مافیہا سے بہتر ہے اور جنت کے تمام گھر ہی انتہائی خوبصورت اور بہترین ہیں۔ درجات کی بلندی اور عمل کی خوبصورتی کا انحصار کمیت کی بجائے کیفیت پر ہے۔ اس لیے تقویٰ اور اتباعِ سنت کو لازم پکڑنا چاہیے۔ مسجد تعمیر کرنے کی فضیلت کی احادیث صحیح بخاری کے علاوہ مسلم' ابوداؤد' ابن ماجہ اور مسند احمد میں بکثرت موجود ہیں' جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مسجد کی تعمیر رضائے الٰہی کے لیے کی جائے تو اس کا اجر جنت کے حصول کی صورت میں ملے گا۔ پھر جنت کے حصول کے لیے صرف مسجد کی تعمیر ہی کافی نہیں ہے' اس کے لیے ایمانیات کی دیگر شروط کا پورا ہونا بھی ضروری ہے۔ مسجد کی تعمیر کے بارے میں اللہ تعالیٰ کو کمیت کی بجائے کیفیت زیادہ مطلوب ہے۔ حلال کمائی کی تھوڑی سی رقم حرام کمائی کے خزانوں سے بہتر ہے۔ مسجد کی تعمیر اور اس کی آبادکاری کے لیے نجس کمائی ہی نہیں نجس عقیدے اور نظریات سے بچنا بھی ضروری ہے۔ از روئے الفاظ قرآنی:

﴿مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ښ وَفِي النَّارِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ۝ اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ فَعَسٰٓى اُولٰۗىِٕكَ اَنْ يَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ۝﴾ (التوبۃ)

''مشرکین کے لیے یہ لائق نہیں ہے کہ وہ اپنی جانوں پر کفر کی گواہی دیتے ہوئے اللہ کی مساجد کو تعمیر کریں۔ ان کے اعمال ضائع ہو گئے' اور وہ ہمیشہ کے لیے آگ میں رہنے والے ہیں۔ اللہ کی مسجدیں تو وہ بناتا ہے جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان لایا اور نماز

قائم کی اور زکوٰۃ ادا کی اور اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرا' تو عنقریب یہ ہدایت یافتہ لوگوں میں سے ہوں گے''۔

امام قرطبیؒ بیان فرماتے ہیں کہ اسلام لانے سے قبل جب حضرت عباس گرفتار ہوئے تو مسلمانوں نے ان پر کفر اور قطع رحمی کا عیب لگایا۔ انہوں نے کہا تم ہماری برائیاں یاد رکھتے ہو اور خوبیاں بھلا دیتے ہو۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پوچھا: کیا تمہاری خوبیاں بھی ہیں؟ انہوں نے جواب دیا: ہاں' ہم مسجد حرام کی تعمیر کرتے ہیں' بیت اللہ کے متولی ہیں' حاجیوں کو پانی پلاتے ہیں۔ ان کے اس جواب کے ردّ میں اللہ تعالیٰ نے مذکورہ بالا آیات نازل فرمائیں کہ مساجد کے احکام کی ذمہ داری اور مشرکین کو اس میں داخلے سے روکنا مسلمانوں پر واجب ہے۔(۱۶)

حافظ عماد الدین ابن کثیر ان آیات کی تفسیر میں ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث ذکر کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اِذَا رَاَیْتُمُ الرَّجُلَ یَعْتَادُ الْمَسْجِدَ فَاشْهَدُوْا لَهٗ بِالْاِیْمَانِ' قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی : اِنَّمَا یَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ)) (۱۷)

''جب تم کسی آدمی کو مسجد میں آتا جاتا دیکھو تو اس کے لیے ایمان کی گواہی دے دو۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: اللہ کے گھروں کو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھنے والے ہی آباد رکھتے ہیں''۔

ان آیات اور ان کی تفسیر سے یہ بات واضح ہوگئی کہ مسجد کی تعمیر صرف گارے' پانی سے نہیں ہے' بلکہ مسجد کی تعمیر میں مسجد کو اللہ کے ذکر' نماز' تلاوت اور اعمالِ صالحہ سے آباد رکھنا بھی شامل ہے۔ اس ضمن میں حافظ ابن کثیر ایک اور روایت لائے ہیں۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اِنَّمَا عُمَّارُ الْمَسَاجِدِ هُمْ اَهْلُ اللّٰهِ)) (۱۸)

''مسجدوں کو آباد رکھنے والے ہی اہل اللہ ہیں''۔

مساجد کو تعمیر کرنا' انہیں آباد رکھنا' ان کی ضروریات کا خیال رکھنا' ان میں خود بھی عبادت کرنا اور عبادت کا ماحول قائم کرنا یہ تمام باتیں عمار المساجد میں شامل ہیں۔ ان اعمال کی ترغیب اور ان اعمال کو بجالانے کے بعد ان پر اجر و ثواب کا حصول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے۔

(جاری ہے)

حواشی

(۱) صحیح البخاری' کتاب المغازی' رقم ۳۷۸۲۔
(۲) صحیح البخاری' کتاب المظالم والغصب' رقم ۲۲۸۹۔
(۳) بیت اللہ اور دیگر عمارات کی فنی تفصیلات کے لیے دیکھئے اردو دائرہ معارف اسلامیہ' جلد ۱۵۔
(٤) تاریخ المسعودی' حصہ دوم' ص ۲٦۰۔
(٥) صحیح البخاری' کتاب الرقاق' باب قول النبی ﷺ کن فی الدنیا کانک غریب او عابر سبیل۔
(٦) سنن الترمذی' کتاب الزہد عن رسول اللہ ﷺ باب منہ۔ (امام ترمذیؒ نے فرمایا: یہ حدیث حسن ہے)
(۷) صحیح مسلم' کتاب الزہد والرقائق۔
(۸) سنن الترمذی' کتاب صفۃ القیامۃ والرقائق والورع عن رسول اللہ ﷺ۔ (امام ترمذیؒ نے فرمایا: یہ حدیث حسن صحیح ہے) معمولی فرق کے ساتھ یہ حدیث سنن ابن ماجہ میں بھی موجود ہے۔
سنن ابن ماجہ' کتاب الزہد' باب فی البناء والخراب۔
(۹) سنن الترمذی' کتاب صفۃ القیامۃ والرقائق والورع عن رسول اللہ ﷺ۔ (امام ترمذیؒ نے فرمایا: یہ حدیث غریب ہے)
(۱۰) سنن الترمذی' کتاب صفۃ القیامۃ والرقائق والورع عن رسول اللہ ﷺ۔
(۱۱) مسند احمد' رقم ۱۲۸۴۳۔
(۱۲) قاضی ابو یوسف' کتاب الخراج بحوالہ تاریخ اسلام از معین الدین ندوی۔
(۱۳) تاریخ اسلام از شاہ معین الدین احمد ندوی' ج ۱' ص ۲۱٦' ۲۱۷۔
(١٤) سنن الترمذی' کتاب الجمعۃ عن رسول اللہ ﷺ باب ما ذکر فی تطییب المساجد۔
(۱٥) صحیح البخاری' کتاب الصلاۃ' باب من بنی مسجدا۔
(۱٦) تفسیر القرطبی۔
(۱۷) سنن الترمذی' کتاب تفسیر القرآن عن رسول اللہ ﷺ باب ومن سورۃ التوبۃ۔
(۱۸) تفسیر ابن کثیر۔

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے شعبہ تدریس کے تحت

ماہِ جون 07ء اور اس کے بعد شروع ہونے والے تدریسی پروگرامز کی تفصیل:

کورس کا نام	اہلیت	تفصیل	شیڈول
1- فہم دین کورس	میٹرک	تجوید و ناظرہ۔ ابتدائی عربی گرامر۔ دین کے بنیادی موضوعات پر لیکچرز	دورانیہ: 11 جون 07ء تا 31 اگست 07ء اوقاتِ تدریس: مغرب تا عشاء
2- ترجمۃ القرآن کورس (سمر کیمپ)	عربی گرامر کا داخلہ ٹیسٹ	مکمل ترجمۃ القرآن۔ منتخب نصاب حدیث	دورانیہ: 18 جون 07ء تا 31 اگست 07ء اوقاتِ تدریس: صبح 7:30 تا 11:30 داخلہ ٹیسٹ: 15 جون 07ء صبح دس بجے
3- رجوع الی القرآن کورس پارٹ (II)	بی۔ اے رجوع الی القرآن کورس پارٹ I۔ اور عربی گرامر کا داخلہ ٹیسٹ	مکمل ترجمۃ القرآن۔ حدیث۔ فقہ۔ اصولِ تفسیر۔ اصولِ حدیث۔ اصولِ فقہ۔ عقیدہ۔ عربی زبان و ادب۔ عالم اسلام اور احیائی تحریکیں: تاریخی اور تجزیاتی مطالعہ اور اضافی محاضرات	دورانیہ: 18 جون 07ء تا 30 مئی 08ء اوقاتِ تدریس: صبح 7:30 تا 11:30 داخلہ ٹیسٹ: 15 جون 07ء صبح دس بجے
4- رجوع الی القرآن کورس پارٹ (I)	بی۔ اے	عربی گرامر۔ عربی ریڈر۔ مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب۔ ترجمۂ قرآن۔ تجوید و حفظ۔ ترکیب قرآن مع عربی گرامر' اصطلاحاتِ حدیث اور مطالعہ حدیث اور اضافی محاضرات	دورانیہ: 10 ستمبر 07ء تا 30 مئی 08ء اوقاتِ تدریس: صبح 8:15 تا 1:00

رابطہ و پراسپکٹس: شعبہ تدریس' مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
36۔ کے' ماڈل ٹاؤن' لاہور فون: 3-5869501' فیکس: 5834000
ای میل: irts@tanzeem.org